

# اندیشوں کے گرفتار

مائل خیر آبادی

# انتساب

اندیشوں کے گرفتاروں کے نام

مائل خیر آبادی



# فہرست

۵	غتابِ الہی	۱
۱۶	اندیشوں کے گرفتار	۲
۲۸	حُسنِ سیرت	۳
۴۴	بہن	۴
۵۰	موم کی گڑیاں	۵
۵۷	نقلی روزہ	۶
۶۸	اولِ انعام	۷
۸۳	چیتا مار	۸
۱۰۴	..... اور دریا میں ڈال	۹
۱۱۴	شیطان کا دربار	۱۰
۱۲۳	۳۰ برس کے بعد	۱۱
۱۳۹	ہیں یہ کچھ لیکن ؟	۱۲
۱۵۲	صلح کا فرشتہ	۱۳
۱۵۷	جھوٹے سہارے	۱۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

# عتابِ الہی

---

یہ عربی زبان کا شاہکار افسانہ ہے جسے ترمیم اور اضافے کے بعد خصوصاً  
ایک کردار بڑھا کر اردو میں شائع کیا جا رہا ہے۔

---

وہ جلد سے جلد شہر میں پہنچ کر اجتماع عام میں شریک ہونا چاہتے تھے انھوں  
نے سوچا تھا کہ شام تک شہر کے اندر داخل ہو جائیں گے۔ امیر شہر کے  
یہاں دعوت کھائیں گے۔ رات کی پرسکون فضا میں آرام کر کے سفر کی تکان مٹائیں  
گے۔ پھر دوسرے دن کارکنوں کے خاص اجتماع میں اپنے حلقہ مشرق وسطیٰ کی تبلیغی  
سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کریں گے۔ اپنے گزشتہ منصوبے کا جائزہ لیں گے  
اور آئندہ کے لئے منصوبہ بنائیں گے۔ وہ سب ملا کر مشرق وسطیٰ کے چالیں  
نمائندے تھے جو مراقش میں ہونے والے ایک عظیم سہمی اجتماع میں شرکت کرنے

کے لئے جارہے تھے، ان کے ساتھ ایک خدمت گار بڑھیا بھی تھی جسے انھوں نے اس کی درخواست پر ساتھ لے لیا تھا۔

چلتے چلتے انھوں نے محسوس کیا کہ دوپہر کے بعد سورج کی رفتار معمول سے زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ انھیں اندیشہ ہوا کہ شام تک شہر میں نہ پہنچ سکیں گے الا یہ کہ سب تیز چلیں — امیر سفر نے سب کو تیز چلنے کا حکم دیا۔ رواں دواں قافلے نے اپنی رفتار بڑھانے میں پوری قوت لگا دی۔ خدمت گار بڑھیا بھی پیچھے پیچھے سب کے ساتھ تھی اس کے لئے مشکل یہ بھی تھی کہ وہ کئی مبلغین کا سامان بھی سر پر لاوے تھی۔ وہ بار بار بہت پیچھے رہ جاتی اور اس کے لئے سب کو ایک لمحہ ٹھہر جانا پڑتا وہ دل میں تو خوش ہوتے کہ اس بہانے سستانے اور دم لینے کے لئے کچھ موقع مل جاتا ہے لیکن جب امیر سفر بوڑھیا کو ڈانٹتا تو سب بھی اپنے امیر کی تائید میں اس ضعیف کو برا بھلا کہنے لگتے۔ بوڑھیا انھیں دعائیں دیتی اور پیچھے پیچھے گھسٹتی جاتی۔

اس طرح سب مراقبہ کی طرف بڑھتے جارہے تھے۔ عصر کے وقت اچانک سب نے ایک عجیب سی بھیانک آواز سنی۔ مبلغ گھبرا گئے پھر ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ انھوں نے اسے بھونچال محسوس کیا۔ انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے زمین نے گردش کرتے کرتے اپنا محور چھوڑ دیا ہو زمین کی یہ کیفیت صرف چند لمحے ہی رہی۔ ان لمحوں کے گزر جانے کے بعد سب نے دیکھا کہ سورج کی چمک دمک ماند پڑنے لگی۔

جھلسا دینے والی ہوا کے تیز جھبوٹے سرد ہونے لگے۔ دیکھتے دیکھتے بادل گھرائے پھرتاریکی اتنی بڑھی کہ راستہ چلنا دو بھر ہو گیا۔ امیر سفر نے حکم دیا کہ اس غلاب سے بچنے کے لئے سامنے والے منہدم معبد میں پناہ لو اس کے حکم کے ساتھ سب اسی طرف لپکے اور کسی نہ کسی طرح معبد کی ایک کوٹھری میں گھس گئے۔ مڑ کر دیکھا تو محسوس کیا کہ جیسے ساری کائنات بحرِ ظلمات میں ڈوبی جا رہی ہو۔

اس کے بعد کالی گھٹاؤں کے غول سارے آسمان پر چھپا گئے پھر بوندا باندی شروع ہو گئی اور پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ گھنگھور گھٹاؤں میں بجلیوں کی کڑک اور چمک اور بادلوں کی دل ہلا دینے والی گرج پیدا ہو گئی۔ بجلیاں اس تیزی سے کوند نے لگیں جیسے آسمان پر عذاب کے فرشتے تلواریں چمکا رہے ہوں۔

مبلغ معبد کے کونوں میں دبک گئے بڑھیا کو دروں کے سامنے جگہ مل گئی۔ وہ کانپتی ہوئی اپنے سامان کے پیچ بیٹھ گئی گھٹنے کھڑے کر کے دونوں ہاتھوں سے اس طرح سے جکڑ لیا کہ وہ خود ایک گٹھری سی بن کر رہ گئی اندھیرا ایسا تھا کہ کوئی کسی کو دیکھ نہ سکتا تھا۔ الا یہ کہ بجلی کوندتی اور اس لمحے وہ ایک دوسرے کو دیکھ لیتے۔

کچھ دیر کے بعد امیر سفر نے چقماق سے قندیل روشن کی۔ اس نے کوئی وظیفہ زیر لب پڑھا اور اپنے پورے رامبازہ جاہ و جلال کے ساتھ گویا ہوا۔

”میرے مسیحی بھائیو! نہ تو یہ صحرا کی آندھی ہے نہ ریگستانی بارش اور نہ یہ عمام





























































































































































































































نہ دیکھا۔

لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب سکینہ بی کے مرنے پر وہ رات بھر بے چین رہے بار بار انا للہ پڑھتے میرے اصرار کرنے پر بھی رات کا کھانا نہیں کھایا عشاء کی نماز کے بعد جو غفلیں پڑھنا شروع کیں تو گیارہ بجے تک پڑھتے رہے۔ اور ان نمازوں میں سجدے اتنے لمبے کئے کہ میں حیران رہ گئی۔ اس حیرانی کے ساتھ اس وقت میری پریشانی اور بڑھ گئی جب میں نے سجدوں کی حالت میں ان کی ہچکیاں سنیں اور سجدہ گاہ کو نم دیکھا۔

میری پریشانی کا سبب تو میری بہنیں سمجھ گئی ہوں گی۔ یعنی شوہر کی پریشانی ہر اچھی بیوی کو پریشان کر دیتی ہے۔ لیکن میری حیرت شاید سمجھ میں نہ آئی ہو۔ میں حیران یوں تھی کہ بی سکینہ لاکھوں کی جائیداد کی مالک ہوتے ہوئے کجوس مکھی چوس تھیں۔ کجوس میں ان کا بڑا نام تھا۔ گھر میں کیسی ہی تقریب ہوتی، کم سے کم پیسہ اٹھانے کی کوشش کرتیں۔ اللہ کی راہ میں ایک پیسہ بھی انھوں نے کبھی نہیں دیا۔ مدرسہ اسلامیہ کے لئے چندہ مانگا گیا۔ صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ امانت صاحب اس معاملہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ان کے پاس جاؤ۔ ہاں بھائی! امانت صاحب کے پاس تو جائیں گے ہی تم کو جو اللہ نے دیا ہے تو کیا قبر میں ساتھ لے کر جاؤ گی اور پھر کیا ہر بات میں میرا شوہر ہی رہ گیا ہے کہ جو بی صاحبہ کے پاس مانگنے گیا خود تو دامن سمیٹ لیا اور دوسرے کی طرف رجوع کر دیا۔ ایسے موقعوں پر سچی بات یہ ہے کہ مجھے بڑا برا لگتا۔

سکینہ بی کے مرنے پر میں جانتی ہوں کہ کسی نے بھی غم کا اظہار نہیں کیا۔ امانت صاحب نے

مجھ سے کہا کہ میت میں جاؤ۔ میں نے صاف انکار کر دیا: "کون کجوس کی میت میں جائے!"  
 "سنت رسول ہے۔ مسلمان کو اس کے مرنے پر بُرا نہیں کہتے۔" میاں امانت صاحب  
 نے میری بات کے جواب میں کہا۔ پھر بھی میں نہیں گئی۔ اس دن کے اخباروں میں سکینہ بی کی  
 موت کی خبر تو آئی لیکن ایسے روکھے انداز میں کہ تو بہ بھلی۔ زیادہ تراخباروں کی سرخیاں یہ تھیں  
 "ایک کجوس خاتون کا انتقال جو لاکھوں کی مالک تھی۔"

لیکن اسی خاتون کے مرنے سے میرے میاں امانت صاحب، صرف امانت صاحب  
 نے ایسا سوگ منایا کہ میں حیران اور پریشان رہ گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ رات بھر نہ سو سکے  
 بارہ بجے کے بعد جب وہ یہ سمجھے کہ میں بھی سو گئی تو بلند آواز سے سکینہ بی کی مغفرت  
 کے لئے الفاظ نکالنے لگے۔

"پروردگار اپنی اس نیک بندی کی مغفرت فرما! میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ ایک  
 بہترین مسلمان خاتون تھیں۔ اے اللہ! سیکڑوں عورتیں بیوہ ہو گئیں، اے اللہ! آج  
 ہزاروں بچے یتیم ہو گئے۔ اے اللہ! اس نیک خاتون کو بخش دے۔"

اور پھر جو رونا شروع کیا تو روتے چلے گئے۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ جھنجھلا کر بولی۔  
 بس ایک تم ہی اللہ کے بندے ایسے ہو کہ اس کجوس کا نام لے رہے ہو ایسی  
 نیک مٹی بھی کیا....."

وہ چونک پڑے۔ "زینب! ایسی باتیں مت کرو۔ مسلمان میت کو ایسا مت  
 کہو۔ تم نے یہ کہہ کر گناہ کیا۔"



”جی ہاں! گناہ کیا۔ سارا شہر گناہ میں مبتلا ہو گیا۔ آخر آپ اتنے بھولے کیوں بنتے ہیں؟“

”بھولا نہیں، سچ کہتا ہوں۔ میرے پاس آؤ۔“

میں جھنجھلائی ہوئی تھی لیکن شوہر کی اداسی پر ترس اُگیا۔ میں ان کے پاس گئی کہنے لگے۔ وہ موٹا سا بڑا رجسٹر تولاد۔

یہ رجسٹر میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اشارہ پا کر رجسٹر اٹھالائی اور پھر ۶.....  
تو بے میرے اللہ!..... اُف اللہ! مجھے معاف فرمایا!..... میں دنگ  
رہ گئی اور اپنے کال پر چانٹ لگانے لگی۔

”تو آپ نے مجھے کبھی بتایا کیوں نہیں؟“

”تاہم تھی کہ نہ بتاؤں۔“

پھر میں نے زیادہ بات نہیں کی۔ کفارہ کے طور پر میں نے دو رکعت نماز پڑھی اور اب اس انتظار میں رہی کہ دیکھوں میاں کیا کرتے ہیں۔ پھر میں بھی رات بھر نہ سوسکی۔

میاں جلدی جلدی اس رجسٹر کی مدد سے کچھ لکھتے اور ایک طرف رکھتے رہے

ایک سچے مجھ سے کہا :-

”کیا عرفان کو جگا سکتی ہو؟“

”ہاں کیوں نہیں! کیا کام ہے؟“

”ابھی صبح صادق اخبار چھپ رہا ہو گا۔ عرفان سے کہو کہ میرا یہ بیان پریس میں

دے آئے۔“

میں نے عرفان کو جگایا۔ ایک مضمون یا خبر یا بیان جو سمجھئے، انہوں نے عرفان کو دیا اور کہا ”بیٹے! جلد جا! اور صبح صادق کے ایڈیٹر کو دے آ۔ زبانی بھی کہہ دینا کہ نمایاں جگہ میں شائع کر دیں۔“

عرفان بائیسکل نکال کر گھر سے بھاگا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد لوٹا۔ اور جواب دیا کہ یہ بیان ضرور شائع ہوگا۔

”الحمد للہ! کہہ کر مجھ سے کہا۔ اب ذرا کچھ کھلا پلا دو کل میرا روزہ ہوگا۔“ میری آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ میں نے جھٹ کھانا پیش کیا۔ میاں کے ساتھ میں نے بھی کھایا دوسرے دن ہمارا روزہ تھا۔

صبح ہوئی، تو میرے گھر پر شہر کے بڑے لوگوں کا تاننا بندھ گیا۔ پریس کے نمائندوں نے بھی میرے گھر کو گھیر لیا اور سب سکیمنہ بی کے حالات دریافت کر رہے تھے۔ یہ بھیڑ دیکھ کر طے کیا گیا کہ آج ایک عام جلسہ کیا جائے اور امانت صاحب اس جلسے میں اپنے اس بیان کی تفصیل فرمائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ صبح کو جب اخبار لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچا تو اسی طرح دنگ رہ گئے، جیسے میں رجسٹر دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی تھی۔ میں نے کہا، اس وقت تو میں سکیمنہ بی کے گھر جا رہی ہوں ان کے پوتی پوتے اور نواسے نواسیوں کو دیکھوں گی۔ پھر میں بھی جلسے میں جاؤں گی۔ عورتوں کے بیٹھنے کا بھی انتظام ہوگا۔“

”ضرور ہوگا میں دن بھر جلسے کے انتظام میں رہوں گا۔ تم آجانا اور عرفان، رضیہ، نصرت اور تجوا کو بھی لانا۔ سب آکر سنیں۔“

”ہاں سب آئیں گے۔“ یہ کہہ کر میں سکینہ بی کے گھر چلی گئی۔ جب میں وہاں پہنچی ہوں تو گھر چھوٹے بڑے گھرانوں کی خواتین سے بھرا ہوا تھا۔ سکینہ بی کی پوتیاں اور نواسیاں زیادہ عمر کی نہ تھیں اور نہ گھر میں کوئی بڑی عمر کا مرد ہی تھا۔ نظم کون سن بھالتا۔ بے چاری لڑکیاں بدحواس ہو رہی تھیں۔ میں نے جا کر نظم سن بھال لیا۔ میں نے دیکھا ساری ہی عورتیں غمزہ تھیں۔ میں نے سنا ساری ہی خواتین کہہ رہی تھیں کہ امانت میاں نے ہم سب کو بڑے لفظ منہ سے نکالنے سے روک دیا۔ ورنہ ہم سب ”میری میت“ کو نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے۔“

ظہر کے بعد میں تمام خواتین کے ساتھ جلسہ گاہ کو گئی۔ اللہ اکبر! ایسا مجمع کسی موقع پر کاہنہ کو کبھی دیکھا ہوگا۔ آدمیوں کا ایک جنگل تھا جو کھڑا تھا وہ تو اچھا ہی ہوا کہ کئی لاؤڈ اسپیکر لگا دئے گئے تھے۔ جلسہ تلاوت کلام پاک کے بعد شروع ہوا اس کے بعد جناب سید امانت حسین صاحب اپنے بیان کی وضاحت کرنے کھڑے ہوئے، تو مردوں اور ہم عورتوں کے مجمع میں ایسا سکوت چھایا گویا جیسے سب کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوں۔ سید امانت حسین نے حمد و ثنا کے بعد کہا :-

”مغر زحاف مریں اور عزیز خواتین! موت برحق ہے، جو آیا ہے وہ ایک نہ ایک دن ضرور مرے گا۔ کسی کے مرنے پر غمزہ ہونا بھی ایک فطری بات ہے۔ اس کے متعلق مجھے

کچھ نہیں کہنا ہے لیکن میں آپ صاحبان کی توجہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نصیحت کی طرف لے جاؤں گا جس میں حضور نے تلقین فرمائی ہے کہ مرنے کے بعد کسی مسلمان میت کو بُرا نہ کہو۔ ایک بار اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ایک عورت کے سامنے مدینے کے سب سے بُرے آدمی کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس عورت نے بتایا ”بی بی آج وہ مر گیا“ یہ سنتے ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس مرنے والے کی مغفرت کے لئے دعا کی۔ عورت کو بڑی حیرت ہوئی۔ پوچھنے لگی کہ جس شخص کو آپ اتنا بُرا کہہ رہی ہیں اب اس کی مغفرت کے لئے دعا کرنے لگیں؟ ام المؤمنین نے بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے دیکھا ہے اور ان سے تعلیم حاصل کی ہے آپ نے مسلمان میت کو بُرا کہنے سے روکا ہے۔“

تو بھائیو اور بہنو! جب ایک بُرے مسلمان کے لئے ہمارے دین میں یہ ریتیں موجود ہیں تو نیک میت کے لئے تو اور زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے یہی بی سکینہ مرحومہ جن کی دینداری، روزہ نماز کی پابندی اور دوسری باتوں سے تو آپ واقف ہیں لیکن وہ ایک بات میں بدنام رہیں۔ آپ سب انہیں کب خوش کہا کرتے تھے اور اس وجہ سے ان کی دینداری بھی شک کی نظروں سے دیکھی جاتی تھی لیکن میں عرض کروں آپ نے وہ حدیث بھی سنی ہوگی جس میں ہے اتفاق اور خیرات اس طرح کرو کہ دلہنے ہاتھ سے دو اور بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ بخدا میں سچ کہتا ہوں، بی سکینہ مرحومہ اس حدیث پر پوری طرح عامل رہیں۔ آپ سب بھائی اور بہنیں میرے متعلق کہا کرتے تھے کہ سید

امانت بڑا فیاض ہے جو کچھ کماتا ہے سب خدا کی راہ میں جھونک دیتا ہے۔ اپنے بچوں کی پروا نہیں کرتا بیوی کو اچھا نہیں پہناتا مگر نہاروں کی رقم ساکلوں، محتاجوں کو بانٹتا رہتا ہے۔ میں عرض کروں۔ دراصل یہ وہ دیہاتی مثل کے مصداق ہے کہ گاؤں میں انا مٹرا آپ پوچھیں گے کیسے؟ میں جواب دوں گا کہ یہ دست غیب مجھے بی سکیمنہ کی وجہ سے ہی حاصل تھا۔

”نعرۂ تکبیر“..... ”اللہ اکبر“

مردوں کے مجمع سے ایک شور بلند ہوا۔ عورتیں رونے لگیں۔ ہم عورتیں تو نرم دل کی ہوتی ہیں مرد بھی رو رہے تھے۔ اور تو اور وہ صاحب جو اپنے ولی باپ کے مرنے پر نہ روئے جو اپنے جگر کے ٹکڑے فرمان کی موت پر صرف ”انا للہ“ کہہ کر رہ گئے وہ حضرت بھی اسٹیج پر کھڑے آنسوؤں سے اپنا رومال تر کر رہے تھے۔ نواب مزیل اللہ خاں صاحب اس جلسہ کی صدارت کر رہے تھے سنا تھا کہ وہ بھی بڑے مضبوط دل کے آدمی ہیں۔ وہ بھی دونوں ہاتھوں سے سر پر کڑے تھے۔ کہنیاں میز پر ٹکی ہوئی تھیں اور آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

سید امانت حسین صاحب پھر کچھ نہ کہہ سکے۔ کچھ دیر کے بعد جب ذرا طبیعت سنبھلی تو منشی امیر احمد صاحب نے بقیہ بیان پڑھا۔ بقیہ بیان دراصل رجسٹر کے حسابات کا کھانا تھا جس سے معلوم ہوا کہ دو سو بائیس خواتین کو امانہ و وظیفے دئے جاتے تھے۔ اڑتالیس مکتبوں کو سالانہ ایک لاکھ روپیہ دیا جاتا تھا۔ تین تین خانے مختلف جگہوں پر قائم تھے

جن کا فرج بھی اتنا ہی تھا۔ اس طرح اور تفصیلات تھیں۔ نیشی امیر احمد صاحب جب یہ تفصیل سننا چکے تو صدر جلسہ اپنے آنسو پونچھ کر اٹھے۔ کھڑے ہو کر فرمایا۔

اب میں جلسہ ختم کرنے سے پہلے مرحومہ کی وہ وصیت سناتا ہوں جو مجھے ابھی ابھی سید امانت حسین نے دی۔ صدر صاحب نے بتایا کہ وہ تمام ادارے جہاں جہاں امداد جایا کرتی تھی۔ مرحومہ نے ان سب کے لئے اتنی ہی رقم کی وصیت فرمادی ہے اور یہ دیکھئے یہ وقف نامہ میرے ہاتھ میں ہے جس پر سید امانت حسین صاحب اور مرحومہ کی ایک بالغ پوتی عائشہ اور ایک بالغ نواسی آمنہ کے دستخط ہیں یہ تینوں اس جلسہ میں موجود ہیں اور قراری گواہ ہیں۔ میں انشاء اللہ اس وقف نامہ کو کل رجسٹرڈ کرادوں گا۔

اس کارروائی کے بعد عصر سے پہلے جلسہ برخواست ہوا۔ اناؤنسر نے اعلان کیا کہ عصر کی نماز یہیں ہوگی۔ چنانچہ عصر کی نماز اسی میدان میں ہوئی۔ مردوں اور عورتوں نے نماز کے بعد دعا کی اور پھر ہم سب اپنے اپنے گھروں کی طرف واپس ہوئے اس دن لوگوں کو معلوم ہوا کہ سید امانت حسین صاحب کی فیاضی کس کی بدولت تھی اور لوگ کس غلط فہمی میں تھے۔ سب تعریف اللہ کے لئے ہے صاحب کمال اور مالک کمال اللہ تعالیٰ ہی ہے وہ جسے چاہے اپنے کمال کا کچھ حصہ دیدے۔

# شیطان کا دربار

”اُف تو بہ! یہ شعلے پھینکنے والے تو دے، یہ دھواں دھار بگولے اور یہ بھیانک دُہن کوہ! خدایا میں کہاں ہوں اور یہاں کیسے آگیا؟“

میں نے آنکھیں ملیں سوچا، خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں مگر نہیں میں کھلی نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ دھواں دھار بگولے حرکت کرتے ہوئے شعلے اُگلنے والے تو دوں میں سما گئے پھر میں نے دیکھا جیسے آگ کے محسوس تو دوں پر بیٹھے ہوں۔ اس! یہ تو جاندار معلوم ہوتے ہیں یہ تو آپس میں کچھ اشارے کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ خدایا یہ کون سی مخلوق ہے جنہیں میں دیکھ رہا ہوں۔ ان کے چہروں پر دھواں چھایا ہوا ہے ان کی آنکھیں انگارے برسا رہی ہیں ان کے جڑے بھیڑیوں کے جڑوں کی طرح ہیں لگتا تو یہ ہے کہ یہ انسان ہیں مگر یہ انسان کیسے؟

ایک گھبراہٹ اور خوف میرے دل پر چھا گیا۔ ابھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا کہ ان آگ کے تو دوں پر بھیانک صورت والے جاندار مجھے پکار اُٹھے :-

”یا ابلیس پر تبلیس!“

اور پھر مکیدم شور مچا "زندہ باد!"

اوہ! یہ شیطان ہیں میرے دل نے کہا۔ میں سوچنے لگا کہ میں نے تو ابلیس پُر تبلیس پڑھا ہے۔ یہ پُر تبلیس کے کیا معنی ہیں؟ میں کچھ سمجھ نہ سکا میری نظر میں ایک بڑی پہاڑی کے تو دے پر تھی جس پر ایک عظیم دھواں دھار گبولے سے نکل کر ایک مجسمہ حرکت کرتا ہوا جا بیٹھا۔ وہ سارے شیطانوں سے زیادہ ہیبتناک اور کیرہم تھا۔ نہ جانے کس طرح مجھے یقین ہو گیا کہ یہی ابلیس ہے۔ میں نے معوذتین پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا اور یہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ سب کیا کرنے والے ہیں؟۔

ابلیس پُر تبلیس یا میرے الفاظ میں تبلیس نے اپنا بھاری جبر اکھولا۔ دھنویں کا ایک گلولہ اس کے منہ سے جھبکے کی طرح نکلا میں نے سنا۔

"ہاں! میرے ساتھیو! اپنی کارگزاری بتاؤ، کیا کیا کار نمایاں کر کے آئے ہو آج جس نے سب سے بڑھ کر کام انجام دیا ہو گا اُسے میں اقلیم الشیطان میں اپنا نائب قرار دیدوں گا"

"ابلیس کے اشارے پر ایک طرف کا ایک تودہ جنبش میں آیا۔ میں نے دیکھا اس تودے پر سے ایک شیطان اُتر آیا ابلیس کے سامنے آیا۔ مجرا بجالایا اور پھر اس طرح اپنی کارگزاری سنانے لگا۔

بسم الابلیس پُر تبلیس۔

یوں تو آج میں نے بہت سے انسانوں، جی ہاں! آدم کے بیٹوں کو بہکایا۔ لیکن مجھے فخر ہے کہ آج میں نے ایک عابد کو غافل کر کے تعزمت میں گرا دیا۔



”ساتھیو! وہ عابد ایک جنگل میں خدائی عبادت کر رہا تھا اچانک میں روشنی بن کر اس کے سامنے نمودار ہوا۔ میں نے روشنی میں سے پکارا ”قبول قبول! اے عبادت گزار بندے تیری عبادت قبول۔ اب تو اس مقام کو پہنچ چکا ہے کہ میں تجھ پر سے عبادت کے سارے ارکان کی پابندی ختم کرتا ہوں۔ اب تو جو چاہے کرے۔ تجھے جنت ملے گی۔“

یا ابلیس! یہ سن کر وہ عابد چونکا۔ روشنی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ حیران تھا کہ کون اسے پکار رہا ہے؟ میں نے سمجھ لیا۔ میں نے پھر کہا ”میں کھلے چھپے بھیدوں کا جاننے والا ہوں۔ میں یہ بھی جاننے والا ہوں کہ تیرے دل میں کیا ہے۔ سن! میں تیرا رب ہوں اور میں تجھ سے خوش ہو گیا۔ میری رضا کے سوا تجھے اور کیا چاہئے؟“

یہ سن کر اُس نے سامنے رکھی ہوئی کتاب اٹھانی چاہی میں سمجھ گیا کہ یہ کتاب قرآن ہے میں نے سوچا اگر اس نے قرآن دیکھ لیا تو میرا داؤں خالی جائے گا اُسے جلد سے جلد کلام الہی سے غافل کر دینا چاہئے۔ میں نے پکارا۔

”اب قرآن کی تلاوت کی تجھے ضرورت نہیں۔ علم دین کے سارے خزانے میں تجھے ودیعت کرتا ہوں۔ اٹھ اور اب جو چاہے کر۔ توجنت کا حقدار ہو گیا۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اُسے سوچنے دیا۔ بولا۔ تو میرا خدا کیسے ہو سکتا ہے۔ خدا سے ہم کلام ہونے کا شرف تو انبیاء علیہم السلام کو حاصل تھا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو کوئی جادوگر ہے یا شیطان۔“

اُف یا ابلیس پُرتبلیس! یہ سنتے ہی میں بوکھلا گیا۔ وہ تو خیر ہوئی اُس نے ”لاحول“ نہیں پڑھی۔ مجھے جھٹ ایک داؤں سوچھ گیا اور میں نے اسی داؤں سے اس کو چیت کر دیا۔ میں نے کھسپانی سی آواز بنا کر کہا:-

”اے عابد! بے شک تو خدا کے کلام کا عالم ہے، اپنے علم کے زور سے بچ گیا ورنہ میں تیرے ایمان کو اُچک ہی چکا تھا۔“  
یہ سنتے ہی عابد کی پیشانی چمک اُٹھی۔ غرورِ علم سے اس کی گردن تن گئی اور سینہ پھول گیا۔

بولا۔ ”علم چیز ہی ایسی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی گمراہ نہیں ہو سکتا۔“  
میں اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔ عابد خوش خوش اُٹھا۔ بوریا پلیٹ کر ایک طرف چل دیا۔

میں پیچھے ہولیا وہ اپنے معتقدین میں پہونچا اور ڈینگ مارنے لگا۔ آج میں علم کی بدولت بچ گیا ورنہ شیطان مجھے اُچک لے جاتا۔“ اور پھر اس نے سارا قصہ سب کو سنایا۔ سب اس کی تعریف کرنے لگے۔“

ساتھیو! میرا خیال ہے کہ میں نے اس کے اندر غرورِ علم بھردیا۔ میں نے اسے اللہ کے فضل سے غافل کر دیا اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک انسان کو اللہ کے فضل سے غافل کر دینا بہت بڑا کام ہے۔ یہ وہ باریک نکتہ ہے جسے میں نے بڑی محنت سے حاصل کیا۔ مجھے امید ہے کہ میرا یہ کام اس محفل میں اکرام کے لائق سمجھا جائے گا۔

میں نے دیکھا، جیسے ہی یہ شیطان چُپ ہوا چاروں طرف سے اس کی تعریف ہونے لگی۔ لیکن ابلیس خاموش رہا اس نے دوسرے شیطان کی طرف اشارہ کیا۔ دوسرا شیطان اپنی جگہ سے اُٹھا۔ ابلیس کے سامنے گیا۔ مجراا داکیا اور پھر ابتدائیکہ کلمات کے بعد یوں اپنی رپورٹ سننے لگا۔

”ساتھیو آج میں نے سب سے بڑا جو کام کیا ہے اس کی مختصر روداد آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ آج میرا گذر ایک مسجد میں ہوا۔ وہاں ایک نوجوان عالم درس قرآن دے رہا تھا۔ میں نے سنا وہ کہہ رہا تھا۔ اسلام محض ایک مذہب ہی نہیں ہے بلکہ مکمل نظامِ حیات ہے۔ اس نظام میں جہاں ایک طرف عبادت کے اصول ہیں اسی طرح سیاست کے قوانین بھی۔ اس نظام میں ایک طرف شادی بیاہ کے قاعدے بتائے گئے ہیں تو دوسری طرف لین دین کے ضابطے بھی۔ اس نظام میں گود سے لے کر گور تک اور مسجد سے میدانِ جنگ تک کے سارے طریقے موجود ہیں۔ لہذا صرف روزہ نماز ہی کر لینا کافی نہیں ہے بلکہ وہ سب کچھ فرائض میں سے ہے جو خدا نے حکم دیا ہے تو پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔“

نوجوان واقعی زبردست عالم معلوم ہوتا تھا۔ اس کا علم نیا تھا۔ میں نے سامعین پر نظر ڈالی۔ ایک طرف ایک چس بجیں شخص بیٹھا نظر آیا۔ میں نے اس کے کان میں پھونکا یہ تو کوئی مودودی معلوم ہوتا ہے۔“

بس پھر کیا تھا۔ چس بجیں صاحب نے بڑے تیکھے پن سے کہا ”جناب !

آپ کا تعلق کس جماعت سے ہے؟

اور پھر آپ سمجھ سکتے ہوں گے کہ میں نے کیا کیا ہوگا۔ دیکھتے دیکھتے کچھ لوگ ایک کے طرفدار ہو گئے اور کچھ دوسرے کے اور پھر وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ میری ضرورت نہیں رہی۔ وہ نوجوان عالم صاحب اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔

یا ابلیس! میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی محفل کو درہم برہم کر دینا اس دین کو ڈھانا ہے جس پر آدم کے بیٹوں کو بڑا ناز ہے اُمید ہے کہ میرا یہ کام پسند کیا جائے گا۔ اس شیطان کے خاموش ہونے پر بھی چاروں طرف سے تعریف کے انگارے برسائے جانے لگے لیکن ابلیس اسی طرح چُپ بیٹھا رہا جس طرح بیٹھا تھا۔ اس نے ایک اور شیطان کی طرف اشارہ کیا اس نے ابتدائی کلمات کے بعد اس طرح کہنا شروع کیا۔

ساتھیو! آج میں نے بازار جا کر دیکھا۔ کچھ لوگ چندہ وصول کر رہے تھے۔ میں نے ایک شخص سے پوچھا یہ کس کے لئے چندہ ہو رہا ہے؟ بتایا کہ ایک گاؤں میں آگ لگ گئی ہے۔ دس بارہ گھر جل کر راکھ ہو گئے۔ وہیں کے بے گھر لوگوں کے لئے امدادی رقم وصول کی جا رہی ہے۔

یہ سن کر میں آگے بڑھ گیا۔ حاجی اینڈ کو میں پہنچا۔ اپنے کوتاہ جڑواں ہر کر کے حاجی حنا سے باتیں کرنے لگا۔ باتوں باتوں میں میں نے یہ سمجھ لیا کہ حاجی صاحب اپنی جیب سے ایک سو ایک ہزار روپیہ نکال چکے ہیں۔

میں نے حاجی صاحب کو سمجھایا کہ آپ زکوٰۃ تو نکالتے ہی ہوں گے۔ اس میں سے دو ہزار دیدیجئے۔ یہ ایک ہزار اصل کا بیج جائے گا۔

حاجی صاحب کو میری یہ بات پسند آگئی۔ انھوں نے نوٹوں کی گڈی صندوقچی میں ڈال دی اور اپنے منیم سے کہا کہ زکوٰۃ میں سے دو ہزار دے دینا اور یہ کہہ کر وہ ظہر کی نماز پڑھنے چلے گئے۔

تیسرے شیطان کے چپ ہونے پر بھی مرجبا کے نعرے بلند ہوئے میں نے اپنے دل میں کہا :-

”خدا یا! ان شیطانوں کو کیسے کیسے باریک نکتے معلوم ہیں جن کے ذریعہ وہ انسان کو ایک عظیم ثواب سے محروم کر دیتے ہیں اور انسان ان کے دھوکے میں آجاتا ہے پھر میں نے اور بہت کچھ دیکھا سنا۔ ابلیس کے اشارے پر ایک ایک شیطان آتا اور اپنی اپنی کارگزاری سنا تا۔ شیطانوں سے داد حاصل کرتا اور اپنی جگہ جا بیٹھتا۔

میں سوچ رہا تھا کہ دیکھنا ہے ابلیس کو کس کی شیطنت پسند آتی ہے سب کے بعد ایک ٹھگنا شیطان ابلیس کے سامنے آیا۔ اس نے زیادہ تمہید سے کام نہیں لیا۔ آتے ہی بولا۔

”آج میں نے ایک مرد کو اسی کی بیوی سے لڑا دیا۔ یہاں تک کہ مرد نے بیوی کو گھر سے نکال دیا۔“

یہ ٹھگنا شیطان اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ ابلیس پکار اٹھا۔ وہ مارا۔ اس کا راز تو آید

و شیطان جنیں کندہاں تو نے وہ کام کیا جو واقعی شیطانوں کے کرنے کا ہے۔ اچھا  
ہاں بتا کس طرح لڑا دیا تو نے دونوں کو ؟

ٹھکنا شیطان بتانے لگا کچھ بھی تو زیادہ بدیہی نہیں پڑی۔ میں نے ایک تعویذ  
کچے دھاگے میں باندھ کر صدر دروازے کے بازو سے باندھ دیا اور ایک طرف  
ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مالک مکان آیا۔ اس نے وہ تعویذ دیکھا تو پکڑ کر کھینچ  
لیا۔ تعویذ کو کھولا، تعویذ کا نقش اس طرح تھا :

ل	ف	ا	غ
رورا	یا عزا زیل	ا	ا
از غوث	ف	تا زن	ف
ل	بیائند	نزدما	ل

وہ دیر تک یہ تعویذ دیکھتا رہا۔ اسے فکر مند دیکھ کر میں اس کے پاس گیا میں نے  
اسے سلام کیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر وہ تعویذ کا نقش چھپا لیا۔ میں نے کہا ”چھپانے  
سے کیا فائدہ ؟ گھر کی خبر لیجئے“

اور یہ کہہ کر میں وہاں سے ہٹ گیا لیکن اس ٹوہ میں رہا کہ دیکھوں گھر میں کیا ہوتا  
ہے مالک مکان گھر میں گیا اور جاتے ہی اس نے بیوی سے پوچھا ”غوث کو جانتی ہو“

بیوی نے جواب دیا ”وہ میرا مومن زاد بھائی، وہی تو ہے۔“  
 ”جی ہاں۔ وہی۔ تو تشریف لے جائیے۔ دعا تعویذ ہونے لگے کہ میں غافل ہو جاؤں۔“  
 اور اس کے بعد غیرت دائرہ کرنے وہ بے نقط سنائیں کہ توبہ بھلی۔ لاکھ لاکھ بیوی نے نہیں  
 کھائیں لیکن مرد نے جھوٹے پکڑ کر اسے گھر سے نکال دیا۔

”یا ابلیس! میں سمجھتا ہوں کہ میں نے تھوڑی محنت کر کے کارِ عظیم انجام دیا۔“  
 یہ تو کوئی کام نہ ہوا۔ یہ تو ہر گھر میں ہوتا ہی ہے۔ سارے شیطانوں نے کہا لیکن ابلیس  
 اس ٹھنکنے شیطان کی شیطنت سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔  
 پھر بولا۔ ایک مرد کو اس کی بیوی سے لڑا دینے کے معنی یہ ہیں کہ انسانوں کے معاشرے  
 کی جڑ کاٹ دی گئی۔ اگر تم سب ہی ایک کام کر جاؤ تو انسان پر وہ عظیم فتح ہوگی جسے دنیا  
 بھلانا سکے گی اور پھر اس میں وہ فتنہ برپا ہوگا جس کا روکنا انسان کے بس کا کام نہیں  
 ہوگا۔“

یہ کہہ کر ابلیس نے نیابت کی سند اس ٹھنکنے شیطانوں کو عطا کی۔ میں حیرت زدہ رہ گیا  
 میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پھر میں نے دیکھنا چاہا۔ لیکن اب وہ سب نظروں سے  
 اوجھل ہو چکے تھے۔ میں آنکھیں کھولے اپنے بستر پر پڑا رہا۔ اچھا تو میں نے خواب دیکھا  
 ہے۔ استغفر اللہ۔ اور پھر میں اپنے محلے کے زمین خان کو یاد کر کے افسوس کرنے لگا۔ اس  
 بیوقوف نے ذرا سے شک پر بیوی کو طلاق دے دی تھی اور پھر خود بھی تباہ ہوا۔  
 اور اس کے بال بچے بھی۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ۔

## ۹۰۳ برس کے بعد

”لیکن اے قیصر! یہ تو آپ کی ایک عقلی دلیل ہے۔ ضروری نہیں کہ عقلی دلیل پر کوئی شخص اپنا دین دھرم تبدیل کر دے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری عقل ناقص ہے۔“  
حکیم صدوقی نے زچ ہو کر کہا۔

”مگر تم جیسے سمجھدار آدمی کے پاس اس عقلی دلیل کا کوئی ٹوڑ نہیں۔“ قیصر روم تھیوڈوسیوس نے کہنا شروع کیا۔ ”کیوں حکیم! کیا وہ خدا جس نے ایک بار دنیا کو پیدا کر دیا اس کے لئے مشکل ہے کہ دوبارہ سارے جہان کو پھر بنا کر دے؟“  
”خدا کے لئے مشکل نہیں ہے۔“

”اچھا تم نے یہ تسلیم کر لیا۔ یہ بتاؤ کہ ایک شخص نے ستر خون کئے اس نے نہ جانے کتنی عورتوں کو بیوہ کیا نہ جانے کتنے رشتہ داروں کو سوگوار کیا۔ نہ جانے کتنے بچوں کو یتیم کیا۔ کیا تم اس نقصان کا اندازہ لگا سکتے ہو؟“

”نہیں اے شہنشاہ!“

اس کے بعد وہ شخص گرفتار ہوا، اور میں نے اسے پھانسی پر لٹکا دیا تو کیا اس کے



کر تو توں کی اُسے پوری سزا مل گئی ہے اسے پورا پورا بدلہ مل گیا ہے  
”نہیں!“

”تو پھر ضرورت ہے کہ ایک ایسا دن آئے جب پورا پورا انصاف کیا جاسکے اور  
کوئی پورے پورے نقصان کا اندازہ کر کے پوری پوری سزا دے سکے۔ بولو  
ضرورت ہے ایسے دن کی ہے“  
”.....“

”حکیم! تم چپ کیوں ہو۔ جواب دو۔“

”حضور! ضروری نہیں کہ ہر بات کا جواب دیا ہی جائے۔ حضور کو خدا نے بحث  
کا وہ ملکہ عطا فرمایا ہے کہ بڑے بڑے عاقل آپ کے سامنے عاجز ہیں۔ اگر کل خدا کسی  
ایسے بلیغ شخص کو پیدا کر دے جو بحث میں آپ کی زبان بند کر دے تو ہے“  
”تو آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”میری عرض وہی ہے کہ آج تک کسی شخص نے بھی آنکھوں دیکھی یہ دلیل نہیں دی  
کہ مرنے کے بعد بھی کوئی زندہ ہو سکتا ہے۔“

”تو کیا خیال ہے تمہارا۔ ایک شخص آکر یہ اطلاع دے کہ میں نے ملک حسین دیکھا  
ہے تو تم جھٹلا دو گے؟“

”کیا معلوم وہ اپنا رعب قائم کرنے کے لئے یہ جھوٹ بول رہا ہو؟“  
”لیکن اگر وہ کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ اور اس جھوٹ سے اس کا کوئی فائدہ نہ ہو؟“

”حضور! میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ پھر مجھے اسی شخصیت کی طرف توجہ دلا رہے ہیں جسے آپ نبی مانتے ہیں۔ میں تو یہ کہہ چکا کہ جو حضرت عیسیٰ کو نبی مانتا ہو اُسے آپ کی بات ضرور مان لینا چاہیے۔ لیکن میرا جیسا شخص جو یہ کہتا ہے کہ جب تک کوئی واضح دلیل نہ ہوگی وہ آپ کے عقیدہ آخرت کو کیسے تسلیم کر لے۔ دیکھئے میں آپ کو یاد دلا دوں کہ آپ وعدہ کر چکے ہیں کہ آپ مجھے قتل نہ کریں گے۔ آپ نے اس اقرار کے ساتھ بحث چھیڑی ہے کہ دین میں کسی طرح کی زبردستی نہیں ہے۔ آپ میرے سامنے واضح دلیل پیش کریں۔ میرا سوال پھر سُن لیجئے۔ آج تک کبھی نہیں دیکھا گیا نہ کہیں سنا گیا کہ کوئی مر کر پھر زندہ ہو سکتا ہے۔ تاریخ میں کوئی ثبوت نہیں کہ مرنے کے بعد دوبارہ مرنے کے اندر جسم ستر جانے کے بعد پھر کسی کو زندگی مل سکی ہو۔ بحث و مناظرہ میں تو جسے اللہ نے زور بیان زیادہ دیا ہے وہ دوسرے کی زبان تو بند کر سکتا ہے مگر دل میں یقین نہیں پیدا کر سکتا۔ مجھے دل کا یقین چاہیے۔“

شہنشاہ تھیوڈوسیوس جو ۴۲۵ء میں روم کا مشہور قیصر گذرا ہے حکیم کی اس منطق سے فکر مند ہو گیا۔ وہ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات پر پوری طرح ایمان لا چکا تھا۔ وہ اپنی ساری قوم اور رعایا سے توحید رسالت اور آخرت کے عقیدہ کو منوا چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے ایسی سمجھ دی تھی کہ وہ ہر ایک کو پوری طرح مطمئن کر دیتا تھا مگر حکیم صدوقی کو وہ مطمئن نہ کر سکا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو حکیم کے مطمئن نہ ہونے پر قوم اور رعایا پھر اپنے پہلے دھرم کی طرف پلٹ جائے۔ قیصر کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا

کہ وہ خدا سے مدد کا طلب گار ہوتا۔ چنانچہ اس نے دل ہی دل میں خدا سے دعا کی۔ اچانک دربار کے باہر آواز بلند ہوئی۔

”مہرم مہرم والا مہرم یا قیصر!“

اور ساتھ ہی دربان نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ ”لوگ ایک نوجوان کو چوری کے جرم میں پکڑ کر لائے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے پاس سے تین سو برس کے پہلے کا سکہ برآمد ہوا ہے۔“

”اسے حاضر کرو“ قیصر تھیوڈوسیوس نے حکیم سے بحث کا سلسلہ روک دیا۔ اور اب وہ ایک بیچ اور منصف تھا۔ مجرم اور کوتوال اس کے سامنے پیش ہوئے۔ مقدمہ اس طرح شروع ہوا۔

کوتوال! حضور! اس نوجوان کے پاس سے یہ سکہ برآمد ہوا ہے۔ سیکڑوں آدمی گواہ ہیں۔“

قیصر: (سکہ دیکھتے ہوئے) کیوں نوجوان! یہ سکہ تمہارے پاس تھا۔“

نوجوان: ”جی یہ سکہ میرا ہے اور یہ میرا مال ہے میرے پاس ایسا ہی سکہ اور ہے۔“

قیصر: ”دکھاؤ۔“

نوجوان: (دوسرا سکہ پیش کرتے ہوئے) ”یہ لیجئے۔ میں نے چوری نہیں کی

اور نہ مجھے دقت ملے۔“

قیصر: ”تم پر کبھی جنون تو نہیں ہوا۔“

نوجوان: ”خدا کا شکر ہے کہ میں نہ کبھی مجنون تھا اور نہ آج ہوں۔ میں پورے شعور کے ساتھ اپنا بیان دے رہا ہوں۔“

قیصر: مگر یہ سکتہ ثابت کر رہا ہے کہ تم کو تین سو برس پہلے کا دغینہ ہاتھ لگ گیا ہے اور تم جانتے ہو کہ ہر دغینہ سرکاری ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ تہیں اس کا خمس (پانچواں حصہ) مل جاتا لیکن تم نے چھپایا اس لئے تم مجرم ہو۔“

نوجوان: ”میں مجرم کیسے ہو سکتا ہوں۔ میں نے بھرے بازار میں باورچی کو پورے اطمینان سے یہ سکہ دیا۔ اگر مجھے چھپانا ہوتا تو مجھے اسے گلا ڈالنا چاہئے تھا۔“

قیصر: ”تم بڑے نڈر نوجوان معلوم ہوتے ہو لیکن تم یہ بھولتے ہو کہ اس سکہ پر تین سو برس پہلا ناٹھپتہ ہے۔“

نوجوان: (بوکھلا کر) تین سو برس، تین سو برس۔ خدا کے واحد کی قسم میں اور میرے دوست تو پرسوں یہاں سے گئے ہیں۔“

قیصر: ”تم کیا کہتے ہو۔ پرسوں جانے کے کیا معنی ہیں۔“

نوجوان: ”.....“

قیصر: تمہاری خاموشی، تمہارا خوفزدہ چہرہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم چور ہو۔“

نوجوان: میں چور نہیں ہوں میں اس سکہ کی وجہ سے نہیں ڈر رہا ہوں۔“

قیصر: ”پھر صاف جواب دو، تمہارے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔“

نوجوان: (جھنجھلا کر) اگر حضور نے انصاف کیا ہوتا تو ہم ساتوں دوست کیوں اپنی

جان بچا کر بھاگتے۔“

قیصر: ”کو تو ال (سے)، اس نوجوان کی پھیلی رپورٹ تمہارے پاس ہے۔“  
کو تو ال: ”میں بالکل ناواقف ہوں۔“

قیصر: ”نوجوان (سے)“ پرسوں تم کیوں بھاگ گئے تھے۔“  
نوجوان: ”چاروں طرف حیران و پریشان ہو کر دیکھتا ہے۔“

قیصر: ”تم پریشان نہ ہو۔ اپنا بیان دو، تم پر ظلم نہ ہوگا۔“  
نوجوان: ”اگر آپ میری جان بخشی فرمائیں اور کہنے دیں تو عرض کروں۔“

قیصر: ”میں خدا کے واحد اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر وعدہ کرتا ہوں کہ تم کو قتل نہ کروں گا۔“

نوجوان: ”خدا کے واحد، خدا کے واحد، عیسیٰ، عیسیٰ، خدایا! میں کیا سُن رہا ہوں  
ایک دن میں یہ کیا ہو گیا۔ پروردگار تیرے بس میں سب کچھ ہے۔“

قیصر: ”نوجوان، تم پر حیرانی کی کیفیت کیوں طاری ہے۔ اپنا بیان دو۔“  
نوجوان: ”تو کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے خدا کو ایک تسلیم کر لیا۔ اور حضرت عیسیٰ کو نبی

مان لیا۔“

قیصر: ”بے شک! میرا یہی ایمان ہے۔“

نوجوان: ”الحمد للہ! یہی میرا وہ جرم تھا جس کی وجہ سے ہم ساتوں دوست پرسوں  
یہاں سے بھاگ گئے تھے۔ یہ کو تو ال صاحب جو آج کہتے ہیں کہ ہم سے ناواقف ہیں۔“

ان کے جاسوس ہماری تلاش میں تھے لیکن ہمارے خدا نے ہمیں حفاظت کی جگہ پہنچا دیا۔

قیصر، حکیم صدوقی اور سارے درباری حیران تھے کہ یہ کیسا نوجوان ہے اور کون ہے اور کیسی باتیں کر رہا ہے۔ سب بڑے دھیان اور نہایت دلچسپی کے ساتھ مقدمہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

قیصر: (نوجوان سے) ”تم اپنا پورا واقعہ سناؤ ورنہ جرم کا اقرار کرو۔“  
نوجوان: ”اب مجھے کیا خوف ہو سکتا ہے۔ اب تو میں اپنا پورا تعارف کر سکتا ہوں سنئے۔ میرا نام ملیخا ہے۔ میں صدروس کا بیٹا ہوں اور محلے خدریس کا رہنے والا ہوں۔ آپ میرے باپ کو بلا کر دریافت کر سکتے ہیں کہ میں چور نہیں۔ آپ میرے محلے والوں سے پوچھ سکتے ہیں کہ میں نے کبھی چوری نہیں کی۔ میں نے جو سکہ پیش کیا ہے۔ یہ وہی سکہ ہے۔ جو میں پرسوں لے کر گیا تھا۔ ایک دن کے اندر آپ نے یہ سکہ ناجائز قرار دے دیا آپ نے بہت اچھا کیا۔ جب ایک دن میں آپ کا ایمان، آپ کا یقین، آپ کا دین بدلا تو سکہ بھی بدل جانا چاہئے۔“

آپ میری باتوں پر تعجب میں کیوں ہیں۔ آپ ہی کے حکم سے کو تو ال ہمارے پیچھے لگا تھا کہ ملیخا اور اس کے دوستوں کو پکڑ لاؤ۔ جرم یہی تھا جو آج آپ کا ایمان بن چکا ہے۔ میں نے ان سارے ہاتھ کے بنائے ہوئے خداؤں اور اپنی جگہ پر طاغوت بن کر بیٹھنے والوں کی خدائی سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی

نبوت کی گواہی دی تھی۔ پرسوں۔ بس یہی میرا جرم ہے کہ آپ ناراض ہو گئے۔ آپ تو خود خدائی کا دعویٰ کر رہے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ آج آپ مسلمان ہیں۔

اے شہنشاہ! میں نے اور میرے نوجوان دوستوں نے کھلم کھلا یہ اعلان کیا تھا کہ ہمارا رب قیصر ڈیسیس (یعنی آپ) نہیں، بلکہ وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے (قیصر ڈیسیس کا نام لیا گیا تو شہنشاہ تھیوڈوسیوس اور درباریوں کو اور بھی حیرت ہوئی) ہم نے آپ کو رب تسلیم نہیں کیا تو آپ نے ہمیں گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے دلوں کو مضبوط کر دیا۔ جب ہم ساتوں نے آپ کا حکم سنا تو ہم نے طے کر لیا، کچھ بھی ہو ہم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو معبود نہ بنائیں گے اگر ہم ایسا کریں تو بہت بے جا بات ہوگی۔ پھر ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہماری قوم تو اللہ رب کائنات کو چھوڑ چکی ہے اور اس کے پاس کوئی مضبوط دلیل بھی نہیں ہے۔ اے شہنشاہ! اب مجھے یہ کہنے میں کیا ڈر ہے کہ اس شخص سے بڑا ظالم اور ناجھ کون ہو سکتا ہے جو ایک خدا کے سوا دوسروں کو اپنا رب بنا گئے۔ اور حضرت عیسیٰ کو نبی نہ مانے۔

اے بادشاہ! ہم نے ذرا جلدی کی۔ اگر ہم ایک دن اور صبر کرتے تو آپ کا مسلمان ہونا دیکھتے۔ ہم اپنی غلطی کی اپنے رب سے معافی مانگتے ہیں۔ ہم نے مشورہ کر کے راہ فرار اختیار کی۔ ایک غار میں جا چھپے۔ اللہ کو رازق ہم مان چکے تھے۔ ہمیں یقین تھا اللہ تعالیٰ ہمیں روزی دے گا۔

اے بادشاہ! جس وقت ہم نے یہ اعلان کیا اور بھاگے جا رہے تھے تو راستے میں ہمیں ایک وفادار کُت ملا۔ وہ ہمارے پیچھے چلا۔ ہمیں کھٹکا پیدا ہوا کہ اگر یہ ساتھ رہا تو ہمارا بھید کھل کر رہے گا۔ ہم نے اُسے ڈھیلے مارے۔ اسے بہت بھگایا۔ لیکن وہ پیچھے لگا رہا حیرت یہ تھی کہ وہ بھونکتا نہ تھا۔ ہمیں اس کی حالت پر رحم آگیا۔ ہم نے اُسے ساتھ لے لیا اور غار میں جا چھپے۔ وفادار کُت غار کے منہ پر اگلی ٹانگیں پھیلا کر سو رہا۔ گویا اس نے بتایا کہ پہلے اُسے کوئی قتل کر دے پھر سات دوستوں تک پہنچے۔ (نوجوان نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے حکیم صدوقی کی طرف انگلی اٹھائی) حضور! اس دربار میں دیکھتا ہوں کہ یہ بزرگ سب سے زیا دہ سمجھدار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ ایک جانور نے ہماری مدد کی۔ افسوس ہے انسان ہے کہ وہ عیسائی کو نبی نہ مانے۔

(نوجوان نے یہ کہا تو حکیم صدوقی گھبرا گیا اور سارا دربار مسکرانے لگا، اس کے بعد ہم دوسرے دن جا گے تو آپس میں کہنے لگے کہ بھلا کتنی دیر سوئے ہوں گے؟ پھر خود ہی کہنے لگے کہ شاید دن بھر یا اس سے کچھ کم ہی سوئے ہوں گے۔ پھر ہم نے خود ہی کہا کہ ہمارا اللہ بہتر جانتا ہے کہ ہمارا کتنا وقت اس حالت میں گزرا۔ پھر ہم کو بھوک لگی رائے یہ ہوئی کہ ہم اپنے میں سے کسی کو چاندی کا یہ سکہ دے کر شہر بھیجیں اور وہ جا کر دیکھے سب سے اچھا کھانا کہاں ملتا ہے۔

میں آپ سے یہ بھی عرض کر دوں کہ ساتوں ساتھی کھاتے پیتے خاندان سے تعلق



رکھتے ہیں بلیخانہ میں سب سے بڑا ہے وہ آپ کے مصاحب کیموس کا لڑکا ہے۔ آپ کیموس سے دریافت کریں کہ میں جھوٹ نہیں کہتا۔ اور کیموس کی کرسی آپ کے دربار میں وہ ہے (نوجوان نے مڑ کر ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا لیکن پھر وہ ہٹا بٹکارہ کیا اور بولا۔ تعجب ہے آج کیموس کی کرسی پر دوسرا شخص بیٹھا ہے) حضور معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں قتل کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ درپردہ ہمارا ہمدرد تھا۔ کاش کہ ایک دن اور اُسے زندگی مل گئی ہوتی۔ خیر۔ آگے ہمارا حال یہ ہے کہ مجھے چنا گیا کہ میں بازار جا کر کھانا لاؤں۔ میں نے چاندی کے سکے جیب میں ڈالے اور کسی سے بات کئے بغیر باورچی کی دوکان پر پہنچا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہے کہ ایک دن میں شہر کی کاپلاٹ ہو گئی۔ آج یہ شہر وہ شہر ہی نہیں جو پرسوں تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک دن میں یہ کیسے کیا ہو گیا شائد کوئی معجزہ آپ نے دیکھا اسی لئے آپ حضرت عیسیٰ پر ایمان لائے۔ ورنہ دلیلوں سے تو کوئی مانسنے والا نہیں۔ انسان کج فہم واقع ہوا ہے خیر۔

میرے ساتھیوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ بڑی ہوشیاری سے جانا۔ اگر پہچان لئے گئے تو ہماری خیر نہیں۔ ہم سب سنگسار کر دئے جائیں گے یا پھر یہ ہوگا کہ ہمیں پکڑ کر پھر اس دین اور دھرم کی طرف لانے پر مجبور کیا جائے گا جسے باطل سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔

میں بڑی ہوشیاری سے شہر میں آیا۔ میں نے جیسے ہی سکے باورچی کو دیا۔ اس نے شور مچا دیا۔ کو تو ال صاحب آپہونچے۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ مجھے اُمید ہے کہ اب جبکہ

آپ خود حضرت عیسیٰ کو نبی تسلیم کر چکے آپ ہمارے ساتھیوں کا اعزاز فرمائیں گے۔ آپ مجھے حکم دیں تو میں اپنے ساتھیوں اور دوستوں کو جا کر یہ خوشخبری سناؤں اور یہاں لے آؤں۔

نوجوان اپنا بیان دے کر خاموش ہو گیا۔ قیصر تھیوڈوسیوس اور درباری سب حیران تھے کہ نوجوان یہ کیا باتیں کر رہا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ نوجوان تم اپنا محلہ اپنا مکان اور اپنے خاندان والوں کو پہچان لو گے؟

”کیوں نہیں!“

اور پھر قیصر سارے درباریوں اور حکیم صدوقی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ آگے آگے نوجوان ایک طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ وہ راستوں اور عمارتوں کو دیکھ کر ششدر ہو رہا تھا۔ بار بار کہہ رہا تھا۔ ”خدا یا! ایک دن میں یہ کیسا معجزہ ہو گیا کہ شہر کی ہر چیز بدل گئی۔ وہ چلتے چلتے ایک عالی شان محل کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس محل کی بنیاد پرانے پتھروں کی تھی۔

”اس جگہ تھا میرا مکان مگر یہ محل نہ تھا۔ میں نے بنیاد کے پتھروں سے پہچانا۔“

نوجوان نے محل وقوع بتا دیا۔ بادشاہ اور درباریوں کو دیکھ کر اہل محلہ جمع ہو گئے۔ صاحب مکان بھی گھبرا کر باہر نکل آیا۔ ایک اجنبی نوجوان کو دیکھ کر سب حیران تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ بادشاہ کے حکم سے مکان کے سارے افراد بچے بوڑھے جوان مرد اور عورتیں سب نوجوان کے سامنے لائے گئے اور نوجوان ہر ایک کو دیکھ کر کہتا رہا

کہ میں اسے نہیں پہچانتا۔ گھر کے ایک پر ضعیف نے ڈرتے ڈرتے بادشاہ سے پوچھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ ہمارے گھر کے افراد کی جانچ پڑتال کیوں ہو رہی ہے۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہم شریف شہری ہیں اور ہم نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا ہے۔

نوجوان خاموش کھڑا تھا۔ اب اُسے ڈر لگنے لگا کہ وہ اپنا تعارف ٹھیک ٹھیک نہ کر اسکا۔ ضرور قتل کر دیا جائے گا۔ بادشاہ نے بھانپ لیا اس نے کہا۔  
”نوجوان ڈرو نہیں۔ تم نے اپنے باپ کا نام کیا بتایا تھا؟“

”صدر وس!“

بادشاہ نے اس پر ضعیف سے پوچھا، ”تم اس نام سے واقف ہو؟“

پر ضعیف: حضور! صدر وس میرے پردادا کا نام تھا۔“

قیصر: تمہارے پردادا کو کتنا زمانہ ہوا؟“

پر ضعیف: ”لگ بھگ تین سو برس۔“

قیصر: تمہارے پاس شجرہ نسب ہے؟“

پر ضعیف: ”جی حضور! ہم شجرہ نسب کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“

قیصر: ”تم نے اپنے دادا کو دیکھا ہے؟“

پر ضعیف: ”جی دیکھا ہے۔ میں نوجوان تھا جب وہ اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔“

قیصر: ”تمہارے دادا کا کوئی اور بھائی بھی تھا؟“

پر ضعیف: جی نہیں، وہ اکیلے تھے۔ میں ان کا پوتا ہوں اور ان کا جائز وارث۔

اگر کوئی اور دعویٰ وار ہے تو وہ یقیناً ہماری جائیداد پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہتا ہے۔  
قیصر: ”تم گھبرا کیوں گئے۔ اس نوجوان کو دیکھو، یہ کہتا ہے کہ میں صدروس  
کا بیٹا ہوں اور اس مکان کا مالک۔“

پیرضعیف: ”ہی ہی ہی ہی حضور! ہم سے بذلہ سنبھی فرماتے ہیں۔ ہمارے لئے آپ  
کی بذلہ سنبی باعثِ فخر ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔ یہ نوجوان یقیناً پاگل ہے۔“  
قیصر: ”بڑے میاں! سنجیدہ بنو۔ جو پوچھا جائے صاف صاف بتاؤ۔ اپنا شجرہ  
نسب لاؤ۔“

پیرضعیف: ”بہت اچھا حضور! پیرضعیف نے گھر کے ایک آدمی کو اشارہ  
کیا۔ وہ جا کر شجرہ لے آیا۔ بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کیا۔“

قیصر: ”یہ دیکھو بڑے میاں! تمہارے دادا کے نام کے برابر کس کا نام اکٹھا ہے؟“  
پیرضعیف: ”(شجرہ دیکھ کر) مگر حضور ملیخا، میرے دادا کا بھائی تو لاپتہ ہو گیا تھا  
وہ تو عیسیٰ پر ایمان لانے کے جرم میں معتوب بارگاہ تھا۔ اس لئے اپنے ساتھیوں  
کے ساتھ بھاگ گیا تھا۔ یہ نوجوان ملیخا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تنہا اپنے دادا کی  
جائیداد کا وارث ہوں اور یہ نوجوان مجنوں ہے۔“

قیصر: (اپنے وزیر آثارِ قدیمہ سے) ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ تین سو برس پہلے  
کس قسم کا لباس پہنا جاتا تھا؟“

وزیر: میں اپنی واقفیت کی بناء پر پورے دثوق سے کہتا ہوں کہ

اس نوجوان کا وہی لباس ہے۔

پیر ضعیف: ”حضور یہ نوجوان وزیر صاحب سے ملا ہوا ہے اور غاصبانہ ہاری جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ کوئی عقلمند آدمی یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا کہ یہ نوجوان تین سو برس گزرنے پر نوجوان ہی رہا۔

قیصر: وہ تو یہی کہتا ہے اور ثبوت میں اپنے ساتھیوں کو پیش کرتا ہے۔  
پیر ضعیف: اگر وہ یہ ثابت کر دے اور ایک عقلمند آدمی مان لے تو میں اسے اس کا حق دیدوں گا۔

قیصر تھیوڈوسیسیس نے حکم دیا کہ کسی تاخیر کے بغیر غار کی طرف چلنا چاہیے۔

وہ اپنے درباریوں، حکیم صدوقی اور ملیخا کے گھروالوں اور دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ ملیخا کی رہنمائی میں غار کی طرف چلا۔ غار کے پاس پہونچا تو کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ ملیخا اسی طرف بڑھ گیا۔ سارا مجمع اس کے پیچھے تھا سب غار کے پاس پہنچے ملیخا نے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ پھر ملیخا اندر گیا۔ اس کے ساتھی پریشان تھے انھوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ واقعی ہم سب پہچانے گئے۔ آؤ دعا کریں کہ اے اللہ جب ہمیں پہچانسی دی جائے تو ہم ثابت قدم ہوں۔ اے اللہ! ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں اس حالت میں موت آئے کہ ہم مسلمان ہی ہوں۔

ملیخا نے سب کو دلا سا ریا۔ حال بتایا اور کہا کہ نہ جانے کیا معجزہ ہوا کہ ایک

دن میں شہر اور شہر والوں کی کایا پلٹ گئی۔ پھر اس نے ماجرا کہہ سنایا اور کہا کہ بادشاہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

”نہیں نہیں ملیں! تم کو دھوکہ دیا گیا۔ اس طرح دھوکے سے بادشاہ ہمیں پکڑنا چاہتا ہے۔“

”ملینا نے سب کو سمجھایا اور آخر کار سب کو غار کے باہر لے آیا۔ بادشاہ سب سے ملاحال پوچھا۔ سب نے کہا کہ ملینا نے جو بیان دیا ہے وہی ہمارا بیان ہے۔ لیکن اب ہم اس غار سے باہر جانا نہیں چاہتے۔ ہمیں پھر نیند لگی ہے۔ اور یہ کہہ کر ملینا نے ملینا کا ہاتھ پکڑا اور اندر جا کر سب لیٹ گئے اور لیٹتے ہی سو گئے۔ پھر لاکھ آوازیں دی گئیں لیکن وہ نہ جا گئے۔“

اب بادشاہ حکیم صدوقی کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: فرمائیے اب آپ کیا کہتے ہیں؟“

حکیم صدوقی کو عینی دلیل مل گئی تھی۔ اس نے اقرار کیا کہ حضرت عیسیٰ نبی برحق ہیں اور آخرت کا دن بھی برحق ہے۔

شہنشاہ تھیوڈوسیس کے حکم سے غار کو تیخال کر دیا گیا۔ پتھر چنواؤں گئے اور کندہ کر دیا گیا کہ یہ ان سات نوجوانوں کی یادگار ہے جو اب سے تین سو برس پہلے اس جرم میں وطن سے بھاگ گئے تھے کہ انھوں نے اللہ کو ایک اور عیسیٰ کو اللہ کا نبی مانا تھا۔ اور ان کا عقیدہ تھا کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب ہر ایک کو خدا

کے حضور اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ اور میں اور حکیم صدوقی اور میری رعایا گواہ ہے کہ  
 یہ ساتوں ۳۹ برس تک اس غار میں سوتے رہے اور پھر میں نے ان سے  
 ملاقات کی۔

(تھیوڈوسیوس قیصر روم ۴۲۵ء)

---

# ہمیں یہ کچھ لیکن؟

چائے پیتے پیتے اچانک مجھے وہ بات یاد آگئی اور میں اُسے کہہ دینے کے لئے بیتاب ہونے لگا۔ آخر میں نے پاپاسے کہہ ہی دیا۔  
 ”آپ کو ایک بات بتا دوں؟“

”ضرور۔ لیکن اپنی امی کی شکایت کرنی ہو تو ذرا ٹھہر جاؤ۔ انھیں اپنے کان بند کر لینے دو۔“ پاپا نے کہتے کہتے مٹی کی طرف دیکھا اور مٹی بُرا سا منہ بنا کر میری طرف دیکھنے لگیں میں نے کہا۔

”نہیں پاپا، میں شکایت نہیں کروں گا۔ میں تو کہہ رہا تھا کہ آج دوپہر کو وہ آئے تھے“  
 ”وہ کون؟“ پاپا نے پوچھا۔

”وہی، امی کے وہ!“ اور میں نے انگلی اپنے سر پر اس طرح گھمائی جیسے میں بتا رہا تھا کہ جن کے سر پر جٹائیں ہیں اور پھر اپنی دائرہی پر ہاتھ پھیر کر منہ جو پھیلا یا تو پاپا ہنس پڑے، بولے:

”اچھا میں سمجھ گیا۔ مٹی کے وہ! تو پھر کیا باتیں ہوئیں اور کتنی دکشنا بھینٹ



کی گئی ان کو بے۔

”یہ تو میں نہیں جانتا۔ ممتی سے ہی پوچھئے!“

”اگر ان کی طرح ہندوستان کی ساری عورتیں سادھوؤں پر عقیدت کے پھول بچھا کر  
کرنے لگیں تو لوگ انجینئرنگ اور ڈاکٹر بننے کے بجائے سادھو بننے کی ٹریننگ لینے لگیں  
گے اور دماغی موچھ مندوانے کے بجائے جٹا دھاری ہو جائیں گے۔ پایا نے ممتی پر بھرپور  
طنز کیا لیکن ممتی نے بُرا نہ مان کر اس طرح پایا کو سمجھایا :-

”وہرم کی باتوں میں مذاق نہیں کرتے۔ وہ واقعی پہنچے ہوئے مہاتما ہیں۔ کتنا  
صحیح صحیح بتاتے ہیں آگے کا حال۔“

”ان سے زیادہ جوش میں جانتا ہوں ممتی! میں جھٹ بول پڑا۔ ممتی نے گھور کر  
مجھے دیکھا۔ بولیں :-

”وہ کیسے ہے“

”لاؤ ممتی! دکھاؤ اپنا ہاتھ۔ ایسی ایسی باتوں جو سولہ آنے ٹھیک ہوں۔“ میں  
نے ممتی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

”چل ہٹ! تو چپ چاپ چائے پی۔“

”آپ میرے جوش کی قدر نہیں کریں۔ خیر کوئی بات نہیں ارے الکا! لا تیرا ہاتھ  
دیکھوں!“ میں نے اپنی چھوٹی بہن کا ننھا منا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ہاں تو الکا!..... میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ تیرا ہاتھ دیکھ کر بھید کی

بات بتاؤں گا۔

”کیا بے پایا اور ممتی ہم دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔

”الکا! تو اپنی ممتی کی بیٹی ہے۔“ پایا زور سے ہنسنے۔ ممتی بھی مسکرا نے لگیں لیکن ان کے تیور کہہ رہے تھے کہ تو سادھوؤں کی ہنسی اڑاتا ہے اور الکا ممتی کو اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہ ان سے میری بات کی تصدیق کرانا چاہتی ہو۔

”اولے لی اُل بے“ پھر الکا نے مجھ سے پوچھا۔

”ارے ہاں تیری عمر تو بتانا بھول ہی گیا۔“

”بتاؤ۔“

”بالکل سچی بات بتاؤں!“

”دیکھ اوٹ پٹانگ نہ بکنا۔“ ممتی نے ہدایت فرمائی

”سچ بات کہنے سے کیا ڈرنا۔ کیوں نہ پایا! میں نے پایا کی طرف دیکھا اور انھوں

نے سر ہلا کر ہوں“ کرتے ہوئے میرا حوصلہ بڑھایا۔ میں نے کہا:-

”ہاں تو الکا! تیرے ہاتھ کی ریکھا بتاتی ہے کہ جب تک تو زندہ ہے تب تک

نہ مرے گی۔!“

یہ سن کر الکا بہت خوش ہوئی اس نے جیب سے ایک پیسہ نکالا اور کہا لو بابو جی

دچھنا!“ اور پایا اور ممتی دونوں ہنس پڑے۔ میں نے پیسہ لیتے ہوئے پھر کہا۔

”دیکھ الکا! جو تشی جو کچھ کہتا ہے، وہی ہوتا ہے، جیسے سادھو بابا نے

بتایا کہ پاپا کی ترقی اسی وقت ہوگی جب ایک چھوٹا موٹا لگیہ کیا جائے گا۔ میں نے بھید بتا دیا اور پاپا سُن کر بوکھلا گئے۔

”کیوں جی! یہ سادھو کیا میرا ”صاحب“ ہے جو مجھے ترقی دے گا؟“  
 ”صاحب نہ سہی، صاحب کا کچھ لگتا ہوگا۔ کیوں نہ ممی؟ میں نے بھولا بن کر کہا۔  
 ”یہ کیا، تمہارے کارن بچے بھی میرا مذاق اڑانے لگے۔“ ممی نے جھنجھلا کر کہا۔ اپنا  
 اپنا عقیدہ اور تشویش ہے۔ پھر میں جو کچھ کرتی ہوں، تم لوگوں کے بھلے ہی کے لئے تو۔  
 اچھا اب یہ بکو اس بندہ ہونی چاہئیے۔“

”بک بک خود کرتی ہو“ پاپا زور سے بولے۔ اسی وقت الکا بول اٹھی۔  
 ”پاپا اچھا لو کئے لیا تا۔ ماں باپ کو بچوں کے چھانے لگنا نہیں چاہئے بچوں پل  
 بلا اچھل پلتا ہے۔“

”اس نے یہ بھی کہا ہوگا کہ جب ماں باپ لڑتے ہوں تو بچوں کو آنکھیں بند کر لینا  
 چاہئیے۔ چلو تم دونوں اپنی آنکھیں بند کرو۔“ پاپا نے ڈانٹ پلائی۔  
 ”ارے ہاں۔ باتوں میں بھول ہی گئی۔ ارے اوسارو! ادھر آنا ذرا! ممی نے  
 نوکر پکارا۔“

”آیا بائی صاحب“ کہہ کر سارو سامنے آیا تو ممی نے کہا ”تھوڑا سا گاجر کا حلوہ  
 سادھو بابا کو دے آنا ان کی کٹیا پر۔“  
 ”اور ان کا سامان ہے“ سارو نے یاد دلایا۔

”میں نے چھ روپے دیدئے ہیں۔ وہ خود انتظام کر لیں گے۔ تو جاذرا جلدی نہیں  
تو سورج ڈوب جائے گا۔“

سمارو سوئی (بادرچی خانے) کی طرف چلا گیا۔ پایا نے بڑی متانت سے پوچھا۔  
”کتنے روپے دئیے ہیں اس کو؟“

”صرف بیس روپے۔“

”یعنی بیس روپے میں مجھے ترقی دلواؤ گی؟“

”ترقی کی بات نہیں۔ سادھو بابا کے مندر میں ایکادشی کے دن کیرتن ہونے والا

ہے۔ دھرم دھیان کے لئے میں نے بیس روپے بھینٹ کئے تو کیا غضب ہو گیا!“

میں نے جلدی جلدی چائے پی۔ اس کے بعد کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے کھیلنے جانا

ہے۔

سمارو نے ایک پلیٹ تیار کر لی تھی۔ وہ مجھ سے تین چار ہی برس بڑا تھا۔ یہی میں کیس

سال کا۔ مئی اس کو اس لئے پسند کرتی تھیں کہ وہ روز سویرے پوجا پاٹ کر لیتا تھا۔ ایک

سال ہونے کو آیا جب سے وہ ہمارے گھر کام کرتا ہے۔ مئی کے چھوٹے سے پوجا گھر (عباد

خانہ) کا پجاری بھی وہی تھا۔ پہلی بار جب سادھو بابا ہمارے گھر آئے تھے تو سب سے پہلے

سمارو نے ہی لیٹ کر انھیں ڈنڈوت کی تھی۔ مئی نے جب یہ دیکھا تو وہ کھل اٹھیں ان

سادھو بابا سے مئی کو اتنی عقیدت کیوں تھی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے مئی کے

خاندان کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا اور کہا تھا کہ میں آپ کے خاندان والوں کو

اس لئے جانتا ہوں کیونکہ میرے پردادا اپنے زمانے میں آپ کے خاندان کے پر و ہت تھے۔ دھرم سے متعلق سارے کام انہی سے کراتے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ تین پڑھیوں کے بعد پھر وہی رشتہ قائم ہو رہا ہے۔

بابا نے جو کچھ بتایا تھا وہ سب ٹھیک تھا۔ میں بھی بھونچکا ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں وہ بابا مجھے اچھے نہیں لگتے تھے۔ بیماروان کے پر د بار ہا تھا۔ بعد میں میں نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ وہ مجھے سمجھانے لگا۔ ”سادھو کی سیوا کرنے سے سورگ ملتا ہے۔“  
سمارو کی اور سبھی باتیں مجھے اچھی لگتی تھیں مگر جب وہ پنڈتائی جتاتا تو میری تیوریاں چڑھ جاتیں۔

اب بابا جی ہر ہفتہ ہمارے یہاں آنے لگے۔ حتیٰ ان کو ہر تیو بار پر بھوجن کراتیں ایک بار بابا جی آتے ہی بولے۔ ”بیٹی تم اُداس سی لگتی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے پاس کوئی چٹھی آئی ہے جس میں کوئی بری بات ہے۔“  
مئی چونک پڑیں اور بڑی حیرت کے ساتھ بابا جی کو دیکھنے لگیں۔ ”آپ نے ٹھیک کہا بابا!“

”تم کو اپنی ماں کی بیماری کی وجہ سے بڑی چنتا ہے۔“

”ہاں بابا! یہی بات ہے۔ تو کیا میں نیکیے جاؤں؟“

”اتنی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

ایک بار سادھو بابا میرے گھر آئے تو مجھ سے بولے ”تم کو اپنی عادتیں ٹھیک

کر لینی چاہئیں۔ تم نے سمارو کے بلا وجہ طمانچہ مارا تھا۔ اس طرح غصہ کرنے سے انسان پاپ میں بندھ جاتا ہے۔“

پاس ہی کھڑا ہوا سمارو اچانک گڑگڑا کر بولا۔ ”باباجی! آپ کو کیسے معلوم ہوا ہے میں نے اس کا بُرا نہیں مانا۔ پھر..... ہے۔“

”سادھوؤں سے کیسے چھپ سکتا ہے؟“

”لیکن باباجی! ہمارے گھر کی باتیں آپ کو کیسے معلوم ہو جاتی ہیں؟“

”بیٹا! تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ میں تمہارے گھر کا پرودہ ہوں۔ تم سب کی جنم کنڈلیا میرے پاس ہیں۔ میں جوتش کا ودوان ہوں۔ یوگی ہوں۔ تمہارا سب کا حال میں کیسے نہ جانوں گا؟“

میں حیران تھا جب معمولِ رخصت کرتے ہوئے اس بار بھی امی نے دس کانوٹ انھیں بھیٹ کر لیا تھا۔ میں نے یہ بات پایا کو بتائی اور ان سے پوچھا ”باباجی کس طرح ہمارے گھر کی ساری باتیں جان لیتے ہیں؟“ پایا نے میرے سوال کا جواب تو نہیں دیا۔ ہاں یہ ضرور کہا کہ ”اب بہت سنبھل کر رہنا ہو گا۔ نہ جانے بابا گھر کی کس چیز پر انگلی رکھ دے اور تمہاری ممی وہ چیز اُسے دے دیں۔“

اس کے بعد شام کو ممی نے پایا سے کہا۔ ”وہ کہہ رہے تھے کہ اس ہفتہ میں کوئی حادثہ ہونے والا ہے۔“

حادثوں کی تو ہمارے گھر باڑھ آئی ہے۔ باباجی ایک حادثے کو کہتے ہیں۔“

”ہمارے گھر جگوان کی بڑی کڑی ہے۔ حادثے ہمارے یہاں کیا ہے؟“  
 ”کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔ ایک بڑا حادثہ تو یہی ہو سکتا ہے کہ اگر میں ان بابا لوگوں کے  
 بارے میں کچھ تم کو بتاؤں تو گھر میں فساد برپا ہو جائے۔“

ممی نے بڑا سامنہ بنایا لیکن پھر صبح پایا کو منہ بنانا پڑا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ صبح  
 کو ناشتہ کچھ ٹھیک سے نہ بنا تھا۔ نہ چائے اچھی لگ رہی تھی اور نہ پوریاں۔ پایا کچھ یونی  
 سا کھاپی کر دفتر چلے گئے۔ دوسرے دن دودھ والے نے حسب معمول جب صبح کو کان پیل  
 دبائی تو ممی دروازہ کھولنے گئیں۔ دروازہ کھلا دیکھ کر ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میں تو  
 کنڈی لگا کر سوئی تھی۔ ان کی زبان سے نکلا۔ پھر جب انھوں نے دیکھا کہ دروازے  
 کی بغل میں سمار و بندھا پڑا ہے اور اس کے منہ میں کپڑا کھونسا ہوا ہے تو چونک سی پڑیں  
 اور انھیں خطرہ محسوس ہونے لگا۔ ممی نے ہڑبڑا کر پایا کو جگایا اور پھر گھر کی ہر چیز دیکھی  
 جانے لگی جہاں سمار و سوتا تھا۔ وہیں بغل میں میری سائیکل کھڑی رہتی تھی۔ سائیکل اب  
 وہاں سے غائب تھی۔ میں نے سمار و کے منہ سے کپڑا نکالا تو وہ رو پڑا۔ اس نے بتایا کہ رات  
 میں چور آئے تھے۔

ادھر ممی نے کہا: ”والان میں سلائی مشین رکھی تھی۔ وہ نہیں ہے۔ رسوئی کے برتن  
 نہیں ہیں۔ ممی تو جیسے پاگل ہو گئی تھیں۔ خیریت یہ تھی کہ جن کمروں میں ہم سوتے تھے وہاں  
 چور نے ہاتھ نہیں مارا تھا۔ باورچی خانہ ہمارے کمرے سے الگ تھا۔ بس چوروں کا  
 چھپا پا کمرے سے باہر ہی پڑا۔“

پاپا نے فوراً گرج سے کارنکالی اور تھانے کی طرف چل دئے۔ محلے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ میں نے بھی سمارو سے واردات کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ معلوم ہوا کہ چورچھت پر سے صحن میں اترے پھر سب سے پہلے مجھے بے بس کر دیا۔ اس کے بعد کنڈھی کھول کر جو لے جانا تھا لے گئے۔ پاپا لوٹے تو ان کے ساتھ تھانیدار صاحب بھی تھے۔ لوگوں نے انھیں گھیر لیا۔ تھانیدار صاحب نے بیانات لئے اور چلے گئے میں نے محسوس کیا کہ پاپا میرے وہ پاپا جو بڑے خوش مزاج تھے۔ آج ان کا مزاج چڑھا سا ہو گیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی۔

دوسرے دن رات کے وقت ہم سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے پاپا کچلداں تھے۔ مٹی نے کہا۔

”دیکھا سا دھو بابا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ حادثہ ہونے والا ہے۔“

”بھارٹ میں جائے تمہارے بابا کا باپ!“

”اگر تم بھی کچھ خیر خیرات اور دان پُن کرتے رہتے تو کاہے کو ایسا ہوتا؟“

”میں کہتا ہوں چپ رہو جی! اگر میں ایسا ہوتا تو آج گھر کا نصفایا ہی تھا۔“

میں نے پاپا کے مزاج کی گرمی محسوس کر لی۔ سوچا کہ چپ چاپ اُٹھ کر کھسک جاؤں اگر کہیں پاپا اور مٹی کا جھگڑا بڑھا تو پھر مجھے روزنا پڑے گا۔ لیکن اسی وقت بھگواں نے ننھی الکا سے ایسی بات کہلوادی کہ جتنی اس کی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ ابھی تک سہمی ہوئی تھی۔ بول پڑی۔



”ایک منت پایا۔ پئے لے ام انکھیں بند کر لیں تو لائے“ سنکر پایا اپنا غصہ بھول گئے اور میں بھی کھکھلا پڑا۔ ممتی نے اُسے کیخ کر گود میں بٹھالیا۔ میں نے دل ہی دل میں الکا کو بڑی ہی دعائیں دے ڈالیں۔ کسی کہنے والے نے سچ ہی کہا ہے کہ کبھی کبھی بچوں کی بھولی باتیں والدین کے بڑے بڑے جھگڑوں کو ٹالنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

دوسرے دن جب صبح سا دھو بابا ہمارے گھر آئے تو پایا گھر ہی پر تھے۔ پایا کے بارے میں میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ سا دھوؤں سے لاکھ بیزار رہی لیکن اگر کوئی سا دھو گھر پر آجائے تو وہ بڑے احترام سے پیش آتے ہیں۔ چنانچہ بابا جی کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ ممتی نے کہا :-

”بابا جی! یہ تو بڑا غضب ہو گیا۔“

”میں سب جانتا ہوں۔“

”آپ نے اخبار میں پڑھا ہوگا“ پایا نے پوچھا۔

”نہیں پایا۔ بابا جی نے اپنے دھیان گیان سے پتہ لگالیا ہوگا۔ کیوں نا بابا جی۔“ میں

نے پوچھا۔

سا دھو بابا میری یہ طنز کی بات سمجھ گئے۔ مسکرا کر بولے۔ ”ٹھیک ہے بیٹا! میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ تجھے بائیسکل مل جائے گی!“

کہاں سے ملے گی بابا جی؟ میں نے جھٹ پوچھا۔

”کہیں نہ کہیں سے مل ہی جائے گی پولیس والے تلاش کر ہی رہے ہیں۔“

”اور اگر پولیس والے نہ تلاش کر سکے تو ماں باپ ہی سے مل جائے گی۔ کیوں نا باباجی! پاپا نے کڑی چوٹ کی لیکن باباجی اس بات کو پی گئے۔ ”بائیسکل کہیں کنوئس میں ملے گی“ یہ کہہ کر باباجی سنبھل کر بیٹھ گئے اور انھوں نے اپنا آسن ٹھیک کیا۔

ان کے جانے کے بعد پولیس والا خبر لے کر آیا کہ سائیکل مل گئی ہے پوچھا گیا۔ کہاں ملی ہے؟ تو بتایا کہ نواب باغ میں کنوئس کے اندر۔

پاپاجی ہنگامہ مکر رہ گئے۔ مٹی کو اس سے اچھا موقع اور کب مل سکتا تھا۔ پولیس۔ دیکھا میں جو کہتی تھی کہ بابا ٹھیک ہی کہتے ہیں لیکن تم کو شواہس ہو تب تو!“

اس بار میں اور پاپا کوئی جواب نہ دے سکے۔ پولیس والا کہہ رہا تھا:-

”دیکھئے آج کل شہر میں چوریاں بہت ہونے لگی ہیں آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ کل ڈپٹی کلکٹر کے یہاں بھی چوری ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے دو چوریاں ہوئیں۔ دونوں بڑے بڑے افسروں کے یہاں۔ ایسے چالاک ہیں چور، آج تک پتہ نہ چلا۔“

”رام رام! ان کی پتی تو بڑی دھرم دان ہیں۔ بڑا پُن دان کرتی ہیں پھر بھی.....“

تم بھی تو بڑی دھرم دان ہو۔“ پاپا نے پھر بات ماری اور می کچھ سوچ کر چپ رہ گئیں

اب پاپا ہر وقت فکر میں رہنے لگے۔ انھوں نے پہلے تو کچھ نہیں بتایا۔ لیکن جب ان کا تبادلہ ہو گیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ تبادلہ کا آرڈر آنے سے پہلے یہ ضرور ان کی زبان سے سنا تھا کہ اس جگہ اور اس شہر کے لوگوں سے مجھے سخت نفرت ہو گئی ہے۔

سمارو کو نوٹس دے دیا گیا۔ مٹی تو چاہتی تھیں کہ وہ ساتھ چلے لیکن پاپا نے صاف

انکار کر دیا۔ سمارو نے بتایا کہ اب وہ اپنے گاؤں چلا جائے گا۔ یہاں نہ ایسی دھرماتما لیکن ملے گی اور نہ میں رہوں گا۔ وہ بھی اپنے گاؤں کو جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

کاریں سامان لے گیا۔ اباجان نے کار آگے بڑھاتے ہوئے کہا: ”چل کر پٹرول بھروالیں۔ پٹرول پمپ پہنچے تو مٹی نے کہا۔ اب ادھر آگے تو ذرا اور آگے بڑھا لو چلتے وقت باباجی کے درشن کر لیں۔ پاپا نے مٹی کی زبان سے یہ سنا تو ماتھے پر تسکین پڑ گئی لیکن مٹی کی بات نہ ٹال سکے۔ کار کا رخ باباجی کی کٹیا کی طرف کر دیا۔ منٹ بھر میں کٹیا کے سامنے سڑک پر کار جارہی۔ ہم سب اترے۔ سڑک سے پیدل ہی کٹیا کی طرف چلے۔ پاس پہنچے تو یک دم سب رُک گئے۔ کٹیا کے آگے ہماری طرف پیٹھ کئے سادھو جی بیٹھے بھنگ کے دم لگا رہے تھے اور غل میں سمارو بیٹھا ہوا چلم پی رہا تھا اور بابا سے کہہ رہا تھا۔

”لو، ان کی بدلی ہو گئی اور وہ چلے گئے۔“

بس یہی سُن کر ہم سب لوگ رُک گئے اور سوچنے لگے کہ سمارو یہاں کیوں ہے پھر سنائی دیا۔ باباجی کہہ رہے تھے: جانے دے ان کو۔ تو نے اچھا کام کیا۔ ویسے بھی میرے ایجنٹ تیری طرح دوسرے بڑے گھرانوں میں نوکر ہیں کہیں نہ کہیں پھر تجھے چپکا دوں گا۔“

میں نے وقت پر اس گھر کی ایک ایک بات آپ کو بتا دی تھی میں سمجھتا ہوں کہ اچھی جاسوسی کی میں نے اچھا خاصہ بے وقوف بنایا ان کو۔“

”یہ تو ہمارا دھندا ہی ہے۔“

”گرو جی۔ وہ چوری کا مال بکایا نہیں۔“

”ابھی تو نہیں بکا۔ سائیکل تو واپس ہو گئی۔ برتن بیچنے کے لئے مراد آباد بھیج دئے گئے ہیں اور سلمانی مشین بریلی کو پرنس تبدیل کرانے۔ اور بھی سامان ہے۔ ڈپٹی کلکٹر صاحب کے یہاں کا اور دوسرے مکانوں کا بھی۔“

”گرو جی! میری ہتھیلی میں کھجلی مہر ہی ہے۔ آج کہیں بھاری رقم ملنی ہے۔“

باہر کھڑے ہوئے میں نے مٹی نے اور پاپا نے یہ باتیں سنیں۔ پاپا نے دبی زبان سے کہا۔ ”رقم نہیں تیرے ہاتھوں کو ٹھکڑیاں ملیں گی۔ اور یہ کہہ کر وہ واپس ہو گئے تو مٹی اور میں دونوں پیچھے پیچھے چلے۔ اگر کرائیں بیٹھے پاپا سیدھے پولیس اسٹیشن پہنچے۔ پھر کیا ہوا؟ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اب کیا ہوا ہوگا۔ پھر پولیس نے کٹیا پر چھاپا مارا۔ چوری کا بے شمار مال برآمد ہوا۔ پھر مقدمہ، پھر بابا کے پورے گروہ کا صفایا وغیرہ۔“

یہی کہانی کے آخر کا حصہ مختصر کر کے میں نے کہانی کو ختم کر دیا۔ یہ کہانی ایک ہندی رسالے سے لی ہے۔ اس کہانی میں ہندوستان کے ایک رستے ناسور کی نشاندہی کی گئی ہے۔ لیکن ہم سادھو بابا کے نام کے بدلے پیر جی اور ان کی معتقد فیملی کے بدلے کسی مسلمان گھرانے کا ذکر کر دیں۔ تو یہی کہانی اس ماحول کی ترجمانی کرنے لگے جو پرست اور دین سے ناواقف مسلمانوں کا ماحول ہے۔ آپ سوچئے کیا ہمارا سماج ایسے لوگوں سے خالی ہے جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ: میں یہ کچھ لیکن نظر آتے ہیں کچھ۔!

## صلح کافر شہ

کھیلنے کھیلنے ننھے سعید کے گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اس نے ٹوٹی ہوئی ٹانگ اٹھائی۔ اب دیکھنے لگا۔ یہ کیسے جڑے۔ وہ سوچتا رہا پھر دوڑ اپنی امی کے پاس گیا اس کی امی اپنے کمرے میں منہ پیٹے پڑی تھیں۔ ”امی! اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔“ اس کی امی نے ایک نظر اُسے دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے انہوں نے جھڑک دینے والے انداز سے کہا۔ ”میں کیا کروں، میرا دل خود ٹوٹ گیا ہے۔“ بھولا سعید کچھ نہ سمجھا۔ وہ ذرا دیر کھڑا رہا۔ مطلب پورا نہ ہوتے دیکھ کر وہ اپنے ابا کے کمرے کی طرف گیا۔ اس کے ابا آرام کرسی پر اُداس بیٹھے تھے۔ نہ جلنے کیا سوچ رہے تھے۔ ننھا ان کے پاس گیا۔ ”ابو میاں! دیکھئے یہ ٹوٹ گیا۔“

تو میں کیا کروں! میرا دل خود ٹوٹا ہوا ہے۔“ اس کے آبانے بھی وہی جواب دیا وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ ذرا دیر کھڑا رہا۔ سوچتا رہا پھر برآمدے میں آیا۔ اس نے کپڑے کے کچھ چیتے پڑے اکٹھا کئے۔ اپنے ڈبے سے ڈور نکال لایا اس نے ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو ٹوٹی ہوئی جگہ پر رکھ کر ڈور سے باندھ دیا اس کے بعد گھوڑے کو کھڑا کیا تو ٹانگ

الگ ہو گئی اور گھوڑا ایک طرف گر گیا۔ اس نے جھٹ ہاتھوں پر سنبھال لیا وہ پھر سوچنے لگا۔ وہ ایک لوٹے میں پانی لے آیا۔ باورچی خانے سے تھوڑا سا اٹھالایا۔ آنا پانی میں گھولایا اپنے خیال میں اس نے ٹی تیار کر لی۔ اس مٹی سے اس نے ٹانگ کو چپکا کر پھر پھیرے پلٹے اور ڈور سے باندھ دیا۔ اس کے بعد گھوڑے کو کھڑا کیا۔ گھوڑے کی ٹانگ پھر الگ ہو گئی وہ گرنے لگا تو سعید نے پھر سنبھال لیا۔ بے چارہ آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ وہ پھر امی کی طرف بھاگا۔

امی! نہیں جڑتا۔

ابھی اس کی امی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ صحن سے اس کے ابائی آواز آئی۔ ”اچھا تو محترمہ! سنبھالئے اپنا گھڑیہ نے آپ کے حقوق ادا کرنے میں اپنی مقدرت سے بڑھ کر حصہ لیا لیکن تمہارے جائز اور ناجائز سارے خرچ برداشت کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ تم کو تو کسی نواب سے شادی کرنی تھی۔

آخری جملہ سن کر سعید کی امی تڑپ گئی۔ ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”میرے باپ نے تو آپ ہی کو نواب سمجھا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ یہ نواب خزانے کا سانپ ہے۔ آپ نے کب اور کون سا ارمان میرا بولور کیا جب کچھ کہا۔ خالی جیب دکھائی آپ کیوں گھر چھوڑیں گے۔ میں خود چلی جاؤں گی۔

میں خزانے کا سانپ ہوں؟“

”تو آپ نے نواب سے شادی کرنے کا طعنہ کیوں دیا؟“

اس طرح کی جھڑپ سُن کر سعید پھر وہاں سے اپنی دھن میں بھاگا۔ اب کی بار وہ اپنے ابا کے کمرے میں گیا۔ میز سے گوندانی اُٹھائی۔ اس نے گوند سے گھوڑے کی ٹانگ جوڑی پھر چیتھڑوں سے پسٹ کرتا گے سے باندھا۔ تھوڑی دیر دیکھتا رہا۔ وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں اس کے آبا اور امی میں تو تو میں میں ہو رہی تھی۔ سعید کو اس جھڑپ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جب آدائیں ذرا کُرت ہو جاتیں تو وہ ادھر دیکھ تولیتا لیکن اُسے اپنے گھوڑے کی ٹانگ کی فکر تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو کھڑا کیا تو وہ کھڑا رہا۔ اس وقت اس نے دیکھا کہ اس کی ماں بُرق اوٹھ کر برآمدے کے برابر سے یہ کہتی ہوئی نکلیں۔ ”روز روز کے یہ ٹھو کے کون سن میرے باپ دور یوں کے لئے اُکتانہ جائیں گے۔ سعید نے دیکھا کہ امی ڈیوڑھی تک پہنچ گئیں۔

”میں کہتا ہوں کہ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔“ یہ سعید کے ابا کی ڈانٹ تھی۔ سعید نے اس ڈانٹ کو اہمیت نہ دی۔ وہ اپنی کامیابی کی خوشی میں تھا۔ اس نے گھوڑے کی ٹانگ جوڑ لی تھی۔ اس نے خوشی میں گھوڑے کو اٹھایا اور یہ کہتا ہوا امی کی طرف دوڑا۔

”امی جڑ گئی۔ امی جڑ گئی۔ یہ دیکھو! یہ اب نہیں گرتا۔“ سعید نے زمین پر گھوڑے کو کھڑا کر دیا۔ ”دیکھو امی! جڑ گئی نا!“

وہ داد طلب نظروں سے کبھی امی کی طرف دیکھتا کبھی ابا کی طرف۔ وہ جڑ گئی جڑ گئی کی رٹ لگاٹے ہوئے تھا۔ اس کی امی کے قدم رک گئے۔

”میرے لال! تو نے اس کی ٹانگ جوڑ لی۔ کوئی میرا ٹوٹا ہوا دل جوڑنے والا نہیں۔“

”آپ ہی کا دل ٹوٹا ہے۔ میرا تو سالم ہے نا!“  
 سعید کی امی اس کے جواب میں کچھ کہنے والی تھیں کہ سعید بول اُٹھا۔  
 ”مجھے دیکھ اپنا دل! میں جوڑ دوں گا۔“  
 تو کاہے سے جوڑے گا؟  
 ”ابا کی گوند دانی سے!“

”ابا کی گوند دانی سے! سعید کی امی یکدم ہنس پڑیں۔ دوسری طرف مردانے کمرے  
 سے بھی قہقہہ بلند ہوا۔

”ہاں بیٹے لے میری پوری گوند دانی حاضر ہے۔ دونوں دل جوڑ دے۔“  
 ”ایک ذرا سے بچے نے ٹوٹی ہوئی ٹانگ جوڑ لی۔ ان سے دل نہیں جڑتا۔“  
 ”جڑتا کیوں نہیں۔ کوئی جوڑنے والا ہو۔“ اور یہ کہتے کہتے سعید کے ابو میاں گوند دانی  
 لئے ہوئے کمرے سے نکلے۔

”یہ کھڑا ہے میرا گھوڑا ابو میاں! اب میں اس پر سوار ہو سکتا ہوں۔“  
 بیٹا! تیری ماں سے تو نہ ہو سکا لیکن تو نے میرا دل جوڑ دیا۔“ اور یہ کہہ کر سعید کے  
 ابو میاں نے اُسے گود میں اٹھالیا۔ مسکرا کر بیوی سے کہا ”جاؤ کیوں نہ میکے؟“  
 ”جاؤں گی تو سعید کو لے کر جاؤں گی۔“  
 ”کیوں؟ یہ میرا بیٹا ہے۔“  
 ”میں بھی اس سے اپنا دل جڑواؤں گی۔“



”لاؤ امی ایہیں جوڑ دوں۔“

”شاباش بٹیا ٹھیک ہے!“ اور یہ کہہ کر سعید کے ابو نے بیوی کا بُرقع

اتار کر پھینک دیا۔ اور پھر بے۔

اور پھر کا جواب ہم سے نہ پوچھئے، یہ ان سے پوچھئے جن کے متعلق کسی

شاعر نے کہا ہے کہ :

بڑا مزہ اُس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

# جھوٹے سہارے

آبادی سے دور بہت دور ایک میدان میں جہاں ہر وقت آنڈھی اور بارش کا کھٹکا لگا رہتا ہے میں نے ایک ڈھیلے اور پتے کو دیکھا دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جی ہاں! باتیں کر رہے تھے۔

پتہ: دوست میں آنڈھی سے بہت گھبراتا ہوں۔ میرے دوست! آنڈھی آئے تو تم میری مدد کے لئے میری پیٹھ پر بیٹھ جانا۔ اس طرح میں آنڈھی کی زد سے بچ جاؤں گا۔ وہ مجھے اڑا کر نہ لے جاسکے گی۔“

ڈھیللا: بارش میری جان کے پیچھے پڑی رہتی ہے جہاں مجھے دیکھا برس ہی تو پڑی اور پھر مجھے ختم کر ڈالتی ہے لیکن دوست، اب مجھے کاہے کا ڈر ہے مجھے تم جیسا ساتھی مل گیا۔ تم جھڑی بن کر مجھے ڈھانپ لو گے۔ مجھے بارش کے بے رحم ہاتھوں سے بچا لو گے۔ سمجھ گئے نا!“

میں حیران تھا کہ یہ بے جان چیزیں باتیں کر رہی ہیں اور باتیں بھی کیسی دور اندیشی کی۔ دونوں بہت اچھے ساتھی ہیں۔“ لیکن تھوڑی دیر بعد میں نے آنڈھی کی

سننا ہٹ اور پھر سرراہٹ اور پھر خنکی محسوس کی اور پھر آسمان ابرا لود ویکھا اور پھر  
 دیکھتے دیکھتے بادل گڑ گڑانے لگے۔ یہ سب اتنی جلد ہو گیا کہ میں اسے منٹ کے حصوں میں  
 تقسیم کروں تو آپ اُسے خواب ہی مانیں گے لیکن سنئے تو ہوا کیا جب آنڈھی کی سرراہٹ  
 ہوئی تو واقعی پتہ ڈھیلے سے اس طرح لپٹ گیا کہ آنڈھی کا اُسے ڈرنہ رہا اور ڈھیلے  
 نے سمجھ لیا کہ اب وہ بھی بارش کے پانی سے بچ جائے گا لیکن جب پانی بہتا ہوا چلا  
 تو ڈھیلہ اس سے پگھلنے لگا۔ وہ پگھل گیا اور پھر پانی پتے کو بہا لے گیا۔ اور مجھے ایسا  
 لگا جیسے میرے دل نے پکارا : ۵

”سب جھوٹے سہارے۔ سہارا بس ایک، اور وہ ہے — خدا کا۔“  
 میری آنکھیں کھل گئیں۔ جانے یہ خواب تھا یا بیداری۔ بہر حال کچھ ہو میری  
 آنکھیں کھل گئیں۔

( ایک انگریزی افسانے سے استفادہ )